صوفیائے بہار (اور) اردو

تصنیف

...الدین دردائی ایم اے (علیگ)

پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی

صوفیائے بہار (اور) اردو

تصنیف

پروفیسر محمد معین الدین دردائی ایم۔اے (علیگ)

مقدمہ

مولانا اعجاز الحق قدوسی

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کراچی

۱۹۷۲

ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ)

ڈائرکٹر

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل

نزد سرسید گرلس

بی۔ روڈ۔ ناظم آباد کراچی ۱۸

تعداد	ایک ہزار
قیمت	آٹھ روپئے

مطبوعہ

ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس پاکستان چوک کراچی

۱۹۷۲ء

انتساب

اُردو زبان و اَدب کے قدر شناس اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قابل فخر فرزند

جناب **حسن علی عبدالرحمٰن** (علیگ) وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کے نام

جن کی علم دوستی، شرافت اور اعلیٰ ظرفی سے میں بہت زیادہ

متاثر ہوا ہوں

محمد معین الدین دردائی

فہرست مضامین

مُقدّمہ

(از جناب مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب)

محترمی پروفیسر محمد معین الدین دُردائی سابق شعبہ اُردو
ایڈورڈ کالج پبنا (مشرقی پاکستان) اُردو ادب کے اُن کہنہ مشق
محققین میں ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ ہمارے ادب
میں ایک جانی پہچانی علمی و ادبی شخصیت ہیں اور اُن کا کام اُن
کے نام کی ضمانت ہے، میں اُن کی نئی تالیف "صوفیائے بہار اور
اُردو" کو متعارف کراتے وقت فخر و مسرت کی ایک عجیب کیفیت
محسوس کر رہا ہوں، اُن کی پہلی کتاب "بہار اور اُردو شاعری"
۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تھی، اِس کتاب میں موصوف نے بہار
میں اُردو شاعری کی ابتدا اور اُس کے تدریجی ارتقا اور صوبہ بہار
کے اُردو شعرا کی خدمات کو نہایت اختصار سے مگر دل آویز طریقے
پر پیش کیا تھا، بہار میں اُردو شاعری کی اَدبی تاریخ کا وہ نقشِ اول

تھا، جس کی ابتدائی تصویر دُردائی کے قلم نے کھینچی، یہ نقش اُبھرتا گیا، اور تحقیقی حلقوں میں نہایت مقبول ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں بہار کے مشہور محقق ڈاکٹر اختر اُورینوی صدر شعبہ پٹنہ یونیورسٹی نے اس اجمال کو تفصیل سے بدلا اور اپنی تحقیق اور قوت مطالعہ سے "بہار میں اُردو" کے نام سے ایک تفصیلی مقالہ لکھ کر بہار میں اُردو کی نظم ونثر کی تاریخ کو یک جا سمو دیا۔ ایک ایسا حسین و دلکش مرقع تھا، جو تاریخی اعتبار سے بھی معیاری تھا، اور ادبی حیثیت سے بھی سدا بہار تھا۔ تاہم نقاش کا نقش ثانی نقش اوّل سے بہتر ہوتا ہے، لیکن نقشِ اول کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اِس کے بعد انھوں نے ایک اور کتاب "ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط" کے نام سے تالیف کی، اس کا موضوع ہندوستان کی قومی زبان اور اُردو ہے، اس میں انھوں نے تفصیل سے اُردو اور ہندی کا تقابلی مطالعہ کر کے ہندی پر اُردو کی فوقیت کو مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے، یہ کتاب اُن کے لسانی عمیق مطالعے کی آئینہ دار ہے۔

اُن کی تیسری تصنیف "جلوے" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس میں دُردائی صاحب نے اُردو ادب کی اُن بارہ ممتاز شخصیتوں کے متعلق جنھیں انھوں نے قریب سے دیکھا تھا

نہایت دیانتداری کے ساتھ اُن کے خاکے لکھے ہیں، ان خاکوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے نہایت ادبی دیانت کے ساتھ جہاں اُن شخصیتوں کے محاسن کو پیش کیا ہے، وہیں ان کی کمزوریوں اور خامیوں کی طرف اشارہ کر کے ایک نقاد کا صحیح فرض انجام دیا ہے۔

پروفیسر دُردائی صاحب نے ۱۹۶۱ء میں تالیف و تصنیف کی وادی میں ایک نیا موڑ اختیار کیا، وہ ادب اور تنقید کے کوچے سے نکل کر تذکرے اور تصوف کی تاریخ کی طرف آئے، اور تصوف کے سلسلۂ فردوسیہ کی تاریخ اور اِس سلسلے کے اٹھائیس صوفیائے کرام کے حالات لکھ کر بہار کی تاریخ تصوف کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اِس برصغیر پاک وہند میں جن روحانی سلاسل کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک سلسلہ فردوسیہ بھی ہے، یہ سلسلہ بھی اس برصغیر میں اسلامی ہندوستان کو تاریخ کے اوائل دور سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اِس سلسلے کے رشد و ہدایت کی کڑی صوبۂ بہار تک ہی محدود رہی۔ اِس سلسلہ کو ہندوستان میں لانے والے اگرچہ شیخ بدرالدین سمرقندی تھے، لیکن جن بزرگ نے اسے فروغ بخشا، اور اِس صوبے میں رشد و ہدایت کے چراغ روشن کئے وہ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری تھے، حضرت شیخ موصوف

نے اس صوبے میں اخلاقی اقدار کی سربلندی، اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اور انسانیت کو فروغ دینے کی جو کوششیں کیں وہ پاک و ہند کی تصوّف کی تاریخ کا نہ صرف ایک روشن باب ہے بلکہ ہمارے لئے باعثِ صد فخر و نازش بھی ہے۔

"تاریخ سلسلۂ فردوسیہ" پروفیسر دُردائی کا وہ عظیم علمی اور ادبی شاندار کارنامہ ہے جس کے متعلق برِصغیر پاک و ہند کے تاریخ اسلام کے ممتاز مصنّف اور اہلِ قلم مولانا صباح الدین عبد الرحمٰن، شریک ناظم دار المصنّفین اعظم گڑھ نے سراہتے ہوئے اس طرح لکھا کہ:

> میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کہ آٹھ سو برسوں سے جو کام کسی سے نہ ہو سکا، وہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس نحیف و ناتواں انسان کے ذریعہ پورا کرا دیا۔

اس کے علاوہ "لسانی مطالعے" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا، اور جس میں انھوں نے زبانوں کے بارے میں مختلف زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔

مشرقی ادیبوں اور اہلِ قلم کی طرح پروفیسر دُردائی بھی مدّت سے غمِ روزگار اور جسمانی بیماری و آزار کا شکار رہیں، اس کے باوجود کہ وہ ہر طرف سے آلام و مصائب میں گھرے ہوئے ہیں، لیکن یہ مصائب و آلام اُن کی قوتِ ارادی کو شکست نہیں دے سکے، وہ برابر لکھتے رہتے ہیں، اور اپنی تحریروں، مقالوں اور تصانیف کے ذریعہ ہمارے اَدب

میں بیش بہا اضافہ کرتے رہتے ہیں:

آفریں باد براین ہمّت مردانہ تو

اُنھوں نے حال ہی میں "صوفیائے بہار اور اُردو" لکھ کر بہار کی تاریخ اَدب اُردو میں ایک سنئے باب کا شاندار اضافہ کیا ہے۔

اِس تاریخی حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف اواخر میں جب بنی امیہ کے مظالم حد سے زیادہ بڑھے، اور زیاد اور حجاج بن یوسف جیسے ظالموں نے جنم لیا، اور اموی دور کے گورنر تمام ملک کو ظلم وستم کی آماجگاہ بنائے ہوئے تھے، ایسے وقت میں اِس ظلم کے ردِعمل میں صوفیائے کرام کا پہلا طبقہ وجود میں آیا، طبقۂ اوّل کے صوفیا میں حضرت حسن بصری، حبیب عجمی، حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم ادھم خاص شہرت رکھتے ہیں۔ طبقۂ اوّل کے صوفیا کا دور ۶۶۱ء سے ۸۵۰ء تک قرار دیا گیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب ملک میں مظالم حد سے زیادہ بڑھتے ہیں، اور لوگ بربریت اور سفّاکی کا شکار ہوتے ہیں، تو اُس وقت خُدا کے خاص بندوں کی توجہ توبہ واستغفار کی طرف ہوتی ہے، اُن پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے، اور یہ جذبہ انفرادی طور پر خدا کے نیک بندوں میں پیدا ہوتا ہے، طبقۂ اوّل کے صوفیا پر بھی کچھ اسی قسم کا ردِعمل ہوا، اِس دور کے صوفیا نے اپنے اِس جذبے کو تحریک کی صورت نہیں دی، بلکہ وہ انفرادی طور پر گوشوں میں بیٹھ کر عبادت الٰہی میں

مشغول ہو گئے، وہ اپنے دل میں اُس دور کی سیاست سے نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اُن کی خلفا اور اُمرا سے نفرت کا اندازہ صرف اِس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ حضرت فضیل بن عیاض کی ملاقات کے لئے گیا، اُس نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے جواب آیا کون ہے؟ باہر سے جواب دیا گیا امیرالمومنین: پھر اندر سے جواب ملا کہ امیرالمومنین کو مجھ سے کیا کام، پھر باہر سے کہا گیا کہ امیرالمومنین کی اطاعت واجب ہے، پھر اندر سے جواب دیا گیا جاؤ مجھے پریشان نہ کرو، پھر باہر سے کہا گیا کہ اگر اجازت نہیں دیتے تو ہم امیرالمومنین کے حکم سے اندر داخل ہوجائینگے، اندر سے جواب ملا میں تو اجازت نہیں دے سکتا، لیکن اگر تم حکماً گھر میں داخل ہونا چاہتے ہو تو ہو سکتے ہو، چنانچہ وزیر اور امیر دونوں گھر میں داخل ہو گئے، حضرت فضیل بن عیاض نے جب اُن کو دیکھا تو فوراً چراغ گل کر دیا، تاکہ ان کی نظر ان دونوں پر نہ پڑے۔ اتفاق سے رات کے اِس اندھیرے میں امیرالمومنین کا ہاتھ حضرت فضیل بن عیاض کے ہاتھ سے چھو گیا، فرمایا کتنا نرم ہاتھ ہے، خدا کرے کہ جہنم کے عذاب سے بچا رہے، ہارون الرشید نے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، فرمایا تمہارے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، اُنھوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھے کسی صوبے کی گورنری دی جائے، رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست کے جواب میں اُن سے فرمایا تھا کہ اے چچا! میں تم کو تمہارے نفس کا امیر بناتا ہوں، ہارون الرشید نے عرض کیا کہ کچھ اور فرمایئے؟ فرمایا کہ یہ ملک تمہارا گھر ہے، اور خدا کی مخلوق تمہاری اولاد ہے، تمہیں ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے، یاد رکھو کہ اگر کوئی غریب بڑھیا تمہاری مملکت میں رات کو بھوکی سوئے گی تو قیامت کے دن وہ تمہارا دامن پکڑے گی۔

صوفیا کے طبقۂ اوّل نے سب سے بڑا کام جو انجام دیا، وہ یہ تھا کہ انھوں نے حکومت سے کنارہ کش ہو کر اپنی بیزاری سے حکومت کو اس کی بے راہ روی کا احساس دلایا جس کے اثرات یہ تھے کہ اسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں جب کہ تصوف نے تحریک کی شکل بھی اختیار نہ کی تھی صوفیا کی اخلاقی طاقتور شخصیت حکام وقت سے زیادہ طاقت ور بنتی جارہی تھی۔ یہی خلیفہ اپنے پورے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ رقہ میں فروکش ہے کہ اسی زمانے میں حضرت عبداللہ بن مبارک مشہور محدث رقہ تشریف لائے، سارا شہر اُن کی تشریف آوری کی خبر سُن کر اُن کے استقبال کے لئے اُمنڈ آیا، یہاں تک کہ ہارون الرشید تنہا رہ گیا، اُس نے اپنی ایک کنیز سے پوچھا یہ کیا قصّہ ہے کہ سب لوگ دوڑے چلے آرہے ہیں، کنیز نے جواب دیا کہ خراسان کے مشہور عالم عبداللہ بن مبارک اس شہر میں تشریف لائے ہیں، اُن کے استقبال کے لئے دُنیا ٹوٹ رہی ہے، یہ ہارون کی بادشاہت نہیں کہ جہاں

بغیر ڈنڈے اور پولس کے لوگ جمع نہیں ہوتے۔

اِس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں صوفیائے کرام کی یہ روحانی طاقت ایک ناقابلِ شکست طاقت بنتی جا رہی تھی۔

زمانہ آگے بڑھتا رہا، اور زمانے کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے رہے صوفیائے کرام کا دوسرا طبقہ اُس وقت وجود میں آیا جب کہ بنو عباس کے عہد میں یونانی علوم و فنون مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنے، عباسی خلیفہ مامون نے "بیت الحکمت" قائم کر کے فلسفہ و حکمت کی کتابوں کے ترجمے کرا کر انھیں عام کیا، جس کے نتیجہ میں عقل نے بے لگام ہو کر مذہب سے بغاوت کی، اور مسلمانوں کے مذہبی عقیدے شک اور انکار میں تبدیل ہونے لگے، قرآنی آیات کی غلط سلط تاویلات کی جانے لگیں اور لوگ عقل کے غیر متوازن سیلاب میں مذہب سے فرار ہونے کی نئی نئی راہیں اختیار کرنے لگے، دوسرے طبقے کے صوفیا نے عقلیت کے اس طوفان کا مقابلہ نہایت عزم و ہمت کے ساتھ اپنی تعلیمات میں عشق الٰہی اور محبت الٰہی پر زور دے کر کیا۔ دوسرے طبقے کے صوفیا میں، حضرت بایزید بسطامی حضرت معروف کرخی، شیخ فرید الدین عطار، حضرت ذو النون مصری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں نے اپنی تمام کوششوں کو اِس مقصد پر مرکوز کر دیا کہ وہ فلسفے کے پیدا کئے ہوئے ذہنی اندھیروں کو عشق الٰہی اور محبت الٰہی کی شمع سے منوّر کریں، حقیقت یہ ہے کہ

طبقۂ ثانی کے صوفیائے کرام کا یہ سب سے بڑا عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے عقلیت کے سیلاب کے رُخ کو موڑ کر، اپنے عمل و قول سے عشقِ الٰہی کی راہ دکھائی، اور شک و انکار سے ڈگمگاتے ہوئے انسانوں کو یقین اور ایمان کی قوت سے مستحکم کر کے اسلامی فلسفہ و فکر کو حیاتِ نَو عطا کی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ صوفیائے کرام کے تیسرے طبقے کی مدت مجتہدین کرام کے فقہ کی تدوین کے بعد شروع ہوتی ہے، جب کہ مجتہدین فقہ کے رائے اور مرضی کے خلاف ان کے فقہ کو آخر کا درجہ دے کر اجتہاد کے دروازے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ہر صاحبِ بصیرت جانتا ہے کہ فکری و نظری حیثیت سے دنیا جس قدر آگے بڑھتی جائے گی، اسی قدر نئے سے نئے مسائل پیدا ہوتے جائیں گے، اور یہ مسائل شرعی نقطۂ نظر سے نئے اجتہاد کے جویاں ہوں گے لیکن اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی، پھر ستم ظریفی یہ کی گئی کہ فقہی مسائل کو اپنی رائے اور خواہشوں کے سانچوں میں ڈھال کر اپنی خواہشاتِ نفسانی کے پورا کرنے کے لئے تاویلات اور حِیَل کا نیا باب کھول دیا گیا۔ اس طرح معرفتِ الٰہی اور تزکیۂ نفس کے چشمے گدلے کئے گئے۔

تیسرے طبقے کے صوفیا نے جنھوں نے اس گھٹن اور تاریکی کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں عمل و فکر کو ہم آہنگ کر کے، عوام کے داخلی اور خارجی مسائل اور زاویۂ فکر کو سمجھ کر، اسلام، انسانیت اور سلامتی کا درس دیا، تزکیۂ باطن کی طرف خاص توجہ دی، اور انسانیت

میں اخلاقی قدروں کو سر بلند کیا، اِس دور کے بعض صوفیا نے قلم کو بھی تصوف کی خدمت کے لئے استعمال کیا۔

دسویں صدی عیسوی تاریخ تصوف میں ایک اہم صدی ہے، اسی صدی میں اسلامی تصوف نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ تصوف کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، تصوف کی بعض اصطلاحات وضع ہوئیں۔

گیارہویں صدی عیسوی میں اسلامی تصوف کا آفتاب نہایت آب و تاب سے نکھر کر سامنے آیا، اِس دور کے شیوخ میں شیخ ابوالقاسم قُشیری، حضرت داتا گنج بخشؒ، خواجہ عبداللہ انصاری، خواجہ ابوسعید ابوالخیر وغیرہ وہ اہلِ قلم بزرگ ہیں، جنھوں نے اسلامی فنِ تصوف، قدیم صوفیا کے تذکرے، اصطلاحاتِ تصوف اور تعلیمات تصوف پر کتابیں لکھ کر گلشنِ تصوف کی نئے طرز سے آبیاری کی، حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" اسی دور میں پاکستان کے مشہور اور تاریخی شہر لاہور میں لکھی، جس کا شمار تصوف کی اعلیٰ ترین کتابوں میں ہوتا ہے، اِس کتاب نے تصوف کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر کے عوام میں اسلامی تصوف کے مقبول بناتے میں نئی راہیں ہموار کیں، اس دور کے صوفیا کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے طریقت کو شریعت کے آئینے میں پیش کیا، جس کی وجہ سے علماء میں بھی تصوّف کے لئے بڑی کشش پیدا ہوئی اور اِس طرح تصوّف

ایک عالمگیر تحریک بن گیا۔

بارھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ اسلامی تصوف نے فلسفے کی شکل حاصل کی، اسی صدی میں تصوف کے بعض اہم سلسلوں کی بنیاد پڑی، اسی صدی میں امام غزالی نے تصوف پر احیاء العلوم جیسی پُر عظمت کتاب لکھ کر حکمت و موعظت کے دریا بہا دیئے۔

اسی صدی میں ہمیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کے تذکرے سے آج بھی عرب و عجم کی محفلیں گونجتی ہیں، جن کا نام آج بھی اہل نظر و صاحبانِ باطن کے لئے سرمایۂ تسکینِ دل و جاں ہے مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں، آپ نے بغداد میں درس و تدریس، وعظ و نصیحت، اصلاح خلق، اور اشاعتِ اسلام کی جو غیر معمولی خدمت انجام دی، اسلامی تصوف کی تاریخ میں وہ اپنی آپ مثال ہے، آپ کے مواعظ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی مجالس وعظ میں ستر ستر ہزار سے زائد اجتماع ہوتا تھا، آج بھی آپ کی کتابیں "فتوح الغیب" اور "فتح ربانی"، اور "غنیۃ الطالبین" اور "فیوضاتِ ربانیہ" طالبان حق کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہیں، شیخ نجیب الدین سہروردی، شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی بھی اسی صدی کی یادگار ہیں، جو اسلامی تصوّف کے اساتین میں شمار ہوتے ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں اسلامی تصوف کی تحریک ایک منظّم

اور منظم اور عالمگیر تحریک بن چکی تھی، اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ طریقت کے سلسلوں کی باقاعدہ داغ بیل پڑی، اِدھر صوفی شعرا نے آتشِ عشقِ الٰہی کو تیز تر کر کے دلوں کو گرمایا، جابجا صوفیا کی خانقاہیں قائم ہوئیں، اور انھوں نے تزکیہ باطن اور اصلاح نفس کے ساتھ ساتھ عوام کے رجحانات اور مسائل کو سمجھ کر اُن کا حل پیش کیا۔

یہ ہے تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کے روحانی کارناموں کا ایک اجمالی تذکرہ جسے میں نے بہت ہی اختصار کے ساتھ "تاریخ مشائخ چشت" سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، لیکن اِن بزرگوں کی ایک اہم خدمت جس پر ابھی تک بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ان کی لسانی اور ادبی خدمت ہے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اگرچہ اعلائے کلمۃ الحق تھا، وہ جہاں جاتے تھے اِس لگن کے ساتھ جاتے تھے کہ اسلام کا نور پھیلائیں، لوگوں کے اخلاق کو سنواریں، انسانوں کے قلوب میں سچّائی اور نیکی کا ذوق پیدا کریں، اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور پیار سے رہنا سکھائیں، ظاہر ہے کہ ہر جگہ کے عوام سے ربط پیدا کرنے کے لئے اُن کی زبان کا سیکھنا، اور انھیں کی زبان میں ابلاغ ضروری تھا، اس لئے یہ بزرگ ان کی زبان سیکھتے، اور ان ہی کی زبان میں ان کو افہام و تفہیم کرتے، چنانچہ خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین اجمیری رح تبلیغ کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے تو آپ نے ملتان میں قیام فرما کر ہندوی

کی زبان سیکھی، ان بزرگوں کے اردو فقرے، دوہے، اور اشعار آج بھی اُردو زبان پر اُن کے احسانات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور ان کا شمار اُردو کے محسنین میں ہوتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ تمام تذکروں اور تاریخوں کی چھان بین کرکے اُردو کے ان ابتدائی محسنوں کی تاریخ مرتب کی جائے، ان کے اُردو فقروں، اشعار، فالناموں، دوہوں وغیرہ کو تاریخی ترتیب کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے، اور اردو کی تاریخ ادب کا یہ باب جو ابھی تک نامکمل ہے، اس کو مکمل کرکے اُس خلا کو پُر کیا جائے، جس کی کمی اُردو ادب کی تاریخ کا ہر طالب علم محسوس کرتا ہے۔

پروفیسر دُردائی صاحب تمام اہلِ علم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس اہم موضوع کی طرف توجہ کی ہے "صوفیائے بہار اور اُردو" اِس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں انھوں نے صوبۂ بہار کے گیارھویں صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک ان ۲۸ صوفیائے کرام کا تفصیلی تذکرہ برسوں کی محنت اور کاوش کے بعد مرتب کیا ہے، جس میں ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ اُردو کے نشو ونما میں ان بزرگوں نے جو حصہ لیا ہے، ان کی واضح مثالیں ترتیب کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہیں، گویا جہاں یہ بہار کے صوفیا کا مجمل تذکرہ ہے وہیں اُردو ادب کے نشو ونما کی ایک مفصل تاریخ بھی ہے، جس کا ارتقا اِس صوبے کے صوفیا کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے

سامنے آتا ہے۔ اِس تالیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ روایتی انداز میں لکھی گئی ہے، ان کی اس کاوش و محنت کو دیکھ کر بے اختیار جوش کے یہ دو شعر زباں پر آجاتے ہیں۔

اے روحِ عصرِ حاضر و اے پاک سرزمیں
لایا ہے ایک نغمۂ سخن داں ترے لئے

اس نغمۂ عظیم کی اللہ ری وسعتیں
چھوڑا نہیں ہے کوئی گلستاں ترے لئے

کتاب کے ذیلی حواشی میں مآخذ کے حوالے جن میں مطبوعہ کتابیں اور مخطوطے دونوں شامل ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۶۲ ہے، فاضل مولف کی بے پایاں جستجو اور تلاش و محنت کو ہمارے سامنے لاتے ہیں، اور اِس تالیف کے استناد، اہمیت اور افادیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

اِس کتاب کے قاری کو ملک کے ممتاز اہلِ قلم جناب سیّد الطاف علی صاحب بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ممنون ہونا چاہیئے کہ موصوف نے اِس کتاب کی معنوی قدر و قیمت کو سمجھ کر کانفرنس اکیڈمی سے اِس تالیف کی نشر و اشاعت کی صورت نکالی، ورنہ اہلِ علم اِس کے استفادے سے محروم رہتے، جنسِ ہنر کو پہچاننا، اہلِ کمال کے فن کی قدر افزائی کرنا، اُن کی محنتوں کو سواگت کرنا، یہ بجائے خود قابلِ تحسین و آفرین ہے۔

پروفیسر دُردائی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں ہمیں یہ مژدۂ جاں فزا بھی دیا ہے کہ یہ گراں مایہ تالیف ان کے اِس موضوع کا پہلا حصہ ہے، ابھی وہ اِس سلسلے کے تین اور حصّے لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جن میں دوسرا حصّہ شمالی ہند، تیسرا پنجاب اور چوتھا حصّہ دکن کے صوفیائے کرام کی لسانی اور اَدبی خدمات اور کوششوں سے متعلق ہوگا۔

آخر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پروفیسر دُردائی صاحب جنھوں نے اس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کے اِس حصّۂ اوّل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کام کی تکمیل کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں، اور وہ تمام مآخذ جو اِس موضوع پر کار آمد ہو سکتے ہیں اُن پر ان کی عمیق نظر ہے، انھوں نے اِس موضوع کا وسیع اور غائر مطالعہ کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اُن سے بہتر اس کام کو دوسرا انجام نہ دے سکے گا۔

میری دلی دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ اُن کو صحت و عافیت سے رکھے، اور ان کے اِس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے کہ اُن کا یہ بیش بہا علمی کارنامہ جس کی تکمیل کا وہ ارادہ رکھتے ہیں اُردو کی اَدبی تاریخ کی اُس کمی کو پورا کر دے گا، جس کی طرف اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے بہت کم توجہ دی ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں،
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اعجاز الحق قدوسی
۲۳ دسمبر ۱۹۷۱ء بوقت ۵ بجے شام

قدوسی منزل، ۵/۴/۵ لیاقت آباد
کراچی - ۱۹

اعتذار

افسوس ہے کہ کتاب ہذا کے درج ذیل صفحات مقدم مؤخر ہو گئے ہیں :-

(۱) صفحہ ۳۷ کی مسلسل عبارت صفحہ ۳۹ پر ہے۔
(۲) سلسلۂ عبارت صفحہ ۳۸ کے آگے صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ کی جائے۔
(۳) صفحہ ۱۱۵ کے آگے ترتیب وار مضمون صفحہ ۱۱۷ پر ہے۔
(۴) صفحہ ۱۱۶ کے بعد صفحہ ۱۱۸ ملاحظہ ہو۔
اس زحمت کو قارئین کرام معاف فرمائیں۔

(بریلوی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

میری کتاب "بہار اور اردو شاعری" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تو بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی محققین اُردو کے حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ بعض احباب نے اسے پھیلا کر لکھنے اور بہار کی اُردو نثر کو بھی اس میں شامل کرنے کی رائے دی چنانچہ اس سلسلے میں میں نے از سرِ نو کتب خانوں کی چھان بین شروع کر دی۔ پھلواری شریف سے جو روحانیت کا سرچشمہ اور رشد و ہدایت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ زمانۂ قدیم سے علم و ادب کا بھی گہوارہ رہا ہے۔ مجھے بہت مواد ملا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے علمی خانوادوں سے وقتاً فوقتاً میں مواد اکٹھا کرتا رہا لیکن لکھنے کے مواقع حاصل نہیں ہوئے۔ پھر پاکستان بنا اور ۱۹۴۸ء میں میں مشرقی پاکستان کے ایک ڈگری کالج میں معلم ہو کر چلا آیا۔ وہ عجیب ہنگامی دور تھا کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ دو تین برس کے بعد ہی میں شدید بیمار ہو گیا اور عرصہ دراز تک ذی فراش رہا۔ اس عرصہ میں یعنی ۱۹۵۶ء

میں ہمارے مکرم دوست ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبہ اُردو پٹنہ یونیورسٹی کی کتاب "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" شائع ہوگئی۔ یہ کتاب ایسی جامع اور محققانہ انداز میں لکھی گئی تھی کہ میں نے اپنی کتاب بہار اور اُردو شاعری کو دوبارہ اضافہ کے بعد شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور وہ سارا مواد جو اکٹھا کیا تھا پڑا رہا۔

ادھر چند ماہ قبل اپنے مقالہ "مشائخ فردوسیہ اپنی تعلیمات کے آئینہ میں" لکھنے کے دوران یکایک خیال آیا کہ اُردو زبان کے حقیقی خالق تو ہمارے صوفیائے کرام ہیں لیکن ان کو اس حیثیت سے باقاعدہ کسی نے پیش نہیں کیا۔ پنجاب، دکن، بہار اور شمالی ہند کے اُردو شعراء اور ادباء کا تذکرہ کرتے ہوئے سرراہے کتابوں میں صوفیائے کرام کا ذکر ضرور آگیا ہے لیکن باضابطہ پھیلا کر ان کی لسانی، ادبی اور علمی کوششوں کو پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ایک ہلکا سا خاکہ بھی میرے دماغ میں آگیا۔ پرانے کاغذات اور یادداشتوں کو دیکھا تو ان میں اس مطلب کے لائق مواد بھی مل گیا اور اس طرح میں اس کتاب کو لکھنے پر آمادہ ہوگیا۔ خیال نے عمل کی شکل اختیار کر لی۔

اس کتاب کا نام بھی میں نے "صوفیائے بہار اور اُردو" ہی رکھا ہے۔ اس میں بہار، شمالی ہند، پنجاب اور دکن کے صوفیائے کرام کی لسانی، علمی اور ادبی خدمات کو زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کے نظم و نثر کے قدیم نمونے اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کو پیش

کہتے ہوئے یہ دکھلایا ہے کہ ان بزرگوں نے اُردو زبان کی تخلیق اور ترویج میں کیسا اہم کردار ادا کیا ہے اور کس کس طرح اس کو پروان چڑھانے کی یہ بزرگ کوشش کرتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے یہ پورا کام ایک آدمی کے بس کا نہیں۔ اتنا پھیلا ہوا اور وسیع کام کسی ادارے کے تحت ہی انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے ابتدا کر دی ہے جتنا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا کروں گا اور جو نہ ہو سکے گا امید ہے اسے دوسرے اہل قلم حضرات پورا کر دیں گے۔

اپنی سہولت کے تحت میں نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ صوبۂ بہار، دوسرا شمالی ہند، تیسرا پنجاب اور چوتھا دکن کے صوفیائے کرام کی لسانی اور ادبی خدمات اور کوششوں سے متعلق ہے۔ فی الحال پہلے حصہ کو، یعنی بہار کے صوفیائے کرام سے متعلق پیش کر رہا ہوں۔

اس مقالے میں زیادہ تر قلمی نسخوں اور مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے اس لئے نمونے پھیلا کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ بعض کے اقتباسات کچھ طویل بھی ہو گئے ہیں لیکن یہ وہ نادر مخطوطے ہیں جو پاکستان میں علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی دسترس سے باہر ہیں اس لئے ہمارے ان طویل اقتباسات کو بربنائے افادیت امید ہے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

بعض مخطوطات جیسے مثنوی ہیر رانجھا از فضل علیؒ اور جواہر الاسرار از قاضی عبدالغفار غفاؔ رحؒ چونکہ میرے ذاتی نسخے ہیں اس لئے ضمیمہ میں ان کو

مکمل شائع کر دیا گیا ہے کہ یہ اردو شعر و ادب کی تاریخ کی اہم کڑی محفوظ رہ جائے اور آئندہ کے محققین کے لئے کام کرنے میں سہولت ہو۔

پیشِ نظر تصنیف میں ہم نے بہار کے صرف ان صوفیائے کرام کو لیا ہے جو اوائل تیرھویں صدی ہجری تک بقیدِ حیات تھے۔ اس طرح ہم نے اپنا دائرۂ عمل گیارھویں صدی ہجری سے اوائل تیرھویں صدی ہجری تک محدود کر دیا ہے۔ یعنی صرف دو سوا دو سو برس کے دوران جن صوفیائے کرام کی تصانیف اور نثر و نظم کے نمونے ملے ان کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تمہید میں البتہ بہت ہی قدیم صوفیاء کے ملفوظات، فالنامے اور دوہوں کو تلاش کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم تیرھویں صدی اور اوائل چودھویں صدی ہجری کے صوفیا کو اس بزم میں شریک کر لیتے تو یہ کتاب بہت ضخیم ہو جاتی اور پھر یہ کام بہت پھیل جاتا۔ آخر میں صادق پوری علماء کے کئی نثر کے قلمی مذہبی رسالوں کو بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ اگرچہ صوفیوں کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ یہ مردانِ مجاہد اور بزرگانِ دین تھے لیکن ان کی تصانیف سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ صوفیائے کرام کے علاوہ تقریباً سب ہی مذہبی ادارے اور اشخاص اردو کی ترقی اور ترویج میں کوشاں تھے۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن جن بزرگوں اور ان کے کتبخانوں کی قلمی کتابوں اور مخطوطات سے مجھے مدد ملی ہے میں اس کے لئے ان سب کا ممنونِ کرم ہوں۔

کراچی ۲ر جولائی ۱۹۷۰ء

محمد معین الدین دردائی

تمہید

اردو زبان کی ترقی اور ترویج میں مسلمان فاتحین سے زیادہ صوفیائے کرام اور بزرگان دین کا ہاتھ رہا ہے۔ مسلمان فاتحین جہاں اپنی تلواروں سے ملک فتح کرتے تھے وہاں یہ صوفیائے کرام اپنی محبت، خدمت اور تعلیم سے اس ملک کے رہنے والوں کے دل جیتتے تھے۔ ان کو کسی بادشاہ اور فوج کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہ فاتحین کے لشکروں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتے تھے بلکہ سلطانی فوجوں سے مستغنی آگے آگے چلتے تھے۔ اور تبلیغ اسلام کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہی ہم خیالی پیدا ہوتی ہے" یہ صوفیائے کرام عوام سے انہیں کی بولی میں گفتگو کرتے اور تعلیم و تلقین کی کوشش فرماتے تھے۔ اور اس طرح وہ اردو کی ترقی و ترویج میں ارادی اور غیر ارادی طور پر بہت اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

عہد وسطیٰ میں عرب و عجم سے گروہ در گروہ صوفیا، دہلی ہوتے ہوئے بہار آئے اور اپنے فیض اور تعلیم و تبلیغ سے وہ روحانی، تہذیبی اور اخلاقی فضا پیدا کر دی جس نے صدیوں سے اجڑے ہوئے پاٹلی پتر (پٹنہ) کو ایک مرتبہ پھر ایشیائی تہذیب کا مرکز بنا دیا۔

ودیاپتی اور کبیر سے پہلے صوفیائے بہار نے یہاں کے عوام سے یہاں کی مقامی بولیوں میں گفتگو فرمائی ہے جس کا ثبوت ان کے نظم و نثر کے قدیم نمونوں سے ملتا ہے۔ صوبہ بہار کے مایۂ ناز محقق پروفیسر حسن عسکری (پٹنہ کالج) نے اپنے ایک گراں قدر مقالہ "قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" میں ان اثرات کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو اسلامی تصوف نے صوبۂ بہار پر ڈالے اور اپنے نمایاں نقوش چھوڑے۔ اسلام کے ان روحانی سرچشموں نے اپنی وسیع المشربی اور رواداری سے ہند و سنسکرتی اور مسلم تہذیب کو ملانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور نتیجہ میں اردو زبان کی اشاعت اور ترقی بڑی محبت اور ہم آہنگی کے ساتھ ہوئی۔

بہار کے ایک بڑے صوفی حضرت قاضی شطاریؒ کا مقبرہ شمالی بہار میں بساڑھ اسٹوپ کے قریب ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلفا میں سید حسین خنگ سوار کے تین اعزاؒ۔ سید حسن خنگسوار، حضرت

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر حسن عسکری کا مقالہ "بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ"

سید احمدؒ اور اُن کے بھانجے حضرت سید محمدؒ، حضرت شیخ فتوؒ اور شیخ برہانؒ بہار کے مختلف حصوں میں عوام کو اپنی تعلیم و خدمت سے فیضیاب کرتے رہے۔ حضرت امام تاج فقیہ یروشلم سے منیر (بہار) ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء میں تشریف لائے اور منیر کے راجہ کو شکست دے کر اس علاقہ کے لوگوں کو اس کے مظالم سے نجات دلائی۔ اور پھر اپنے تین فرزندان حضرت اسرائیلؒ، حضرت عبدالعزیزؒ، اور حضرت اسمٰعیلؒ کو جنوبی اور شمالی بہار میں بندگانِ خدا کی رشد و ہدایت کے لئے متعین فرما کر واپس فلسطین چلے گئے۔ حضرت مخدوم شہاب الدین جگجوتؒ، حضرت مخدوم شیخ شعیب فردوسیؒ، حضرت مخدوم سید احمد چرم پوشؒ، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ، حضرت مولانا مظفر بلخی فردوسیؒ، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی فردوسیؒ، حضرت حسن دائم جشن بلخی فردوسیؒ، حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخی فردوسیؒ، حضرت سید مخدوم بدر عالم، حضرت ابراہیم بن ابو بکر موسوم بہ ملک بیاؒ، حضرت سید جلال الدین ہلسہؒ، حضرت منہاج راستی پھلواروی۔ غرضیکہ فردوسیہ، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، مداریہ اور شطاریہ سلسلوں کے صوفیائے کرام کا ایک سیلاب تھا جو صوبۂ بہار کے چپہ چپہ پر امنڈ آیا۔ اور وہاں کی سرزمین اور عوام کو روحانیت کے صاف و شیریں پانی سے سیراب کر گیا۔

ا؎ تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی تصنیف "تاریخ سلسلہ فردوسیہ"۔

صوبہ بہار میں قدیم اردو کے نمونے حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ (۶۶۱ھ ۔ ۷۸۲ھ) کے عہد سے ہی ہمیں ملنے لگتے ہیں۔ آپ کے دوہے، فالنامے، کچھ منترے، مجرب نسخے، نقش اور طلسمات اب منظرعام پر آگئے ہیں مثلاً معدن المعانی میں جو حضرت مخدوم الملکؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، ایک جگہ حضرت مخدوم الملکؒ اور ان کے رفیق خواجہ جلال حافظ ملتانیؒ کے درمیان گفتگو کا تذکرہ اس طرح آیا ہے:۔

> ہمدرین محل جلال الدین مذکور گفت کہ بزبان ہندوی[۱]
> نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است "باٹ بھلی پر سانکری"
> بعد ازاں بندگی مخدوم عظمہ اللہ بر زبان مبارک راند
> "دیس بھلا پر دور"۔

"باٹ بھلی پر سانکری" یعنی راہ اچھی پر تنگ اور "دیس بھلا پر دور" کی ترکیب بتلاتی ہے کہ کھڑی ریختہ بن چکا تھا اور یہ ہندو فارسی عربی الفاظ کو لئے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

ایک دفعہ حضرت مخدوم الملکؒ سفر کر رہے تھے۔ سردی کا موسم تھا۔ شب گذاری کے لئے کسی گاؤں میں رکے اور کسی کاشتکار کے پوال کے ڈھیر میں اپنے جسم کو سردی سے بچانے کے لئے چھپا لیا تھا۔ گاؤں والوں کی نظر پڑ گئی تو لوگوں نے ان کو پکڑ لیا کہ ماجرا کیا ہے

۱؎ معدن المعانی مطبوعہ ۱۳۰۱ھ ص ۳۰۳

آپ نے گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ :-

"دودھ منہو ترک جھنونا بھاتی" یعنی دودھ کو چھوڑ تنگ ہونا نہیں بھاتا۔"

یا حضرت مخدوم الملک رح کا یہ شعر، نسخہ اور فالنامہ :-

شرفا[۲] گورڈر اون نس اندھیاری رات ۔۔۔ واں نہ پوچھے کوئی تمہاری جات

نسخہ لودھ[۳] پھٹکری مردار سنگ ۔۔۔ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک

افیون چنا بھر مرچیں چار ۔۔۔ ارد برابر تھو تھا ڈال

پوست کے پانی میں پوڑی کرے ۔۔۔ انکھ کے پیر اترتے بریں

فالنامہ: دس[۴] چار کچھ آگم آوے ۔۔۔ آٹھ پانچ پھل مانگے پاوے

تین گیارہ پہنچے راج ۔۔۔ نو سو سترہ کرے اکاج

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں حضرت مخدوم الملک رح کا ایک گیت مندرجہ ذیل درج کیا ہے وہ اس طرح ہے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط اللھم صل علیٰ محمد و آل محمد۔۔

کرتا بیدن ہرتا دہی سرجن ہار۔۔۔۔۔۔ جوک ہورت میں تمہیں

---

[۱] "قرون وسطی کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" از پروفیسر عسکری مطبوعہ ساتھی پٹنہ سنہ ۱۹۵۲ء [۲-۳-۴] بہار اور اردو شاعری از معین الدین دردائی ص ۱۳ بحوالہ ملفوظات قلمی خاندانی۔

ساکھی دھرت ہوں جو کچھ فلانے کے پنڈ پران میں ہوے،
راہ کا، باٹ کا، کوتے کا، پوکھر کا، اندھیاری کا، اجیالی کا،
چوٹ کا، پھیٹ کا، کٹے کا، اکرائے کا، بھیجے کا، بھجائے کا،
لانگھے کا، الکھین کا، دیو دانو، بھوت پلیت، راکسس
بھوکس، ڈائن ڈکن سکھن کچن، چوڑیل، میل ملان،
جان بھوان......... گلٹی پھرکی، باڈ گولا، سرخ باد،
سبز باد، سیاہ باد زرد باد، وہفتاد دو باد، ہر بادے
کہ باشد۔ درد جو دخلان جن اپکار دسس ہے۔ دوہائی
سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو۔ بیک بلا جائے
بیک بلا جائے..........

سراپ جی جی کرنت، تی تی مرنت ..... کالا ہنسا
نرملا بسے سمندر تیر بنکہ پسارے بکہ ہرے، نرمل کرے
سر پر درد رہے نہ پیر۔ بحق لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ
این دوہرہ کا سہ بار بخواند۔

گرد چھوس دربار کی سو درد دور ہو جائے [۱]

علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی اپنی تصنیف نقوش سلیمانی میں دلسنہ ضلع
پٹنہ کے کتب خانہ کے ایک قلمی بیاض کے حوالے سے یہ فالنامہ درج کیا گیا ہے۔ [۲]

۱؎ پنجاب میں اردو ص ۱۴۳

۲؎ نقوش سلیمانی ص ۴۹۔

۱۱۱ جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی
۱۱۳ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے۔
۱۳۱ ابہیں انھیں ناہیں۔
۳۱۱ ابھیں ناہیں سوت رہو جائے۔
۳۳۳ ناہیں ہرگا اور کام کرو۔
۳۳۱ راج پاٹ اچل کے دیا تمکوں
۲۳۲ آگے مرے دن گئے اب سکھ پاوہ گے
۲۳۲ ابھیں ناہیں آگو ہوئے گا

ڈاکٹر اختر اورینوی نے (پٹنہ کالج) اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ میزیؒ کا ایک اور فالنامہ بھی درج کیا ہے۔ جو ان کو سید شاہ نقی حسن صاحب بلخی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوحہ ضلع پٹنہ کے ذاتی کتب خانہ سے ملا تھا۔ اس قلمی نسخہ کے کاتب حضرت میر جعفر حسینؒ ہیں اور اس کی سنہ کتابت ۱۰۹۷ھ ہے:۔

فالنامہ :۔ ناہیں کیوں کر ہو نصیب لاگی بات ہے۔
ناہیں ابھیں ناہیں ابھیں کچھ

جو من چنتا ہو، سستی پاؤگی

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ کے محبوب مرید اور جانشین حضرت مولانا مظفر بلخی فردوسیؒ کے بھی کچھ دوہے اور ملفوظات ملتے ہیں مثلاً مونس القلوب میں مذکور ہے کہ حضرت مخدوم الملکؒ کے انتقال کے وقت حضرت مولانا مظفر بلخی فردوسیؒ عدن میں تھے انہوں نے خواب میں اپنے پیر کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں :ـ

آئیں[1] رات سہائیاں جن کارن ڈھئیاں کھائیاں

حضرت مخدوم مولانا مظفر بلخیؒ کا ایک دوہا بھی مشہور ہے :ـ

جی[2] گگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی زنیاں جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائیں گتیاں

حضرت مخدوم مولانا مظفر بلخیؒ کے مکتوبات میں بھی کہیں کہیں ایسے دوہے نظر آجاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام عوام سے قریب ہونے کے لئے ان کی مقامی بولیوں میں نصیحت آمیز دوہوں کو اکثر منظوم کرتے رہتے تھے اور اس طرح زبان اردو کی تعمیر غیر ارادی طور پر ہوتی جا رہی تھی مثلاً :ـ

آدمی[3] کوں تن بکھرو اجنگل کر نہ اداس کنکر چنیہ جل بنہ دسنی نہ چھوو نہ پاس

---

[1] "قرون وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" از پروفیسر حسن عسکری مطبوعہ پٹنہ جرنل جلد دہم ص۶ [2] بہار اور اردو شاعری از معین الدین دردائی ص۱۴
[3] از قلمی نسخہ مکتوبات مولانا مظفر بلخیؒ در کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ مکتوب ۱۷۳۔

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے خالہ زاد بھائی اور ہم عصر حضرت مخدوم سید احمد چرم پوشؒ (درگاہ انبیر بہار شریف) کی زبان مبارک سے بھی نکلے ہوئے کچھ فقرے ضیاء القلوب میں ملتے ہیں۔ ایک موقع پر اپنے مقامی مریدوں کو زاہد اور پارسا کا فرق انہوں نے اس طرح سمجھایا تھا:-

میٹھا من نمونہ شرومنی کہا ہوئے   انہیں بید ہا بیدان میاں سٹر کسی کوئے

حضرت سید محمد امجھریؒ بن سید درویش محمد قادری جیلانیؒ جن کا نسبی تعلق حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے ملتا ہے، بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ آپ جب بغداد شریف سے ہندوستان تشریف لائے تو سب سے پہلے صوبہ بہار ضلع گیا کے ایک جنگل میں مرکز بنا کر خدمت خلق میں مشغول ہو گئے اور وہاں بسنے والے کول سرداروں اور گوالوں میں تبلیغ اسلام کرنے لگے۔ اس وقت بہار کا گورنر دریا خاں تھا۔ شروع میں تو اس نے ان پر کوئی توجہ نہ دی لیکن رفتہ رفتہ جب اس کو ان کی بزرگی کا علم ہوا تو اس نے آپ کے لئے ایک کوشک اور خانقاہ تعمیر کرادی۔ لیکن حضرت کو یہ آرام پسند نہ آیا اور آپ اس جگہ کو چھوڑ کر امجھر شریف ضلع گیا میں منتقل ہو گئے۔ اور وہیں آپ کا ۹۴۰ھ میں وصال ہوا۔ ابھی تک آپ کے خاندان کے کچھ لوگ وہاں آباد ہیں جو آپ کی درگاہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آپ نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی تھی۔ آپ کے ایک خاص مرید حضرت علی شیر شیرازی قادریؒ نے آپ کے بعد بغداد شریف سے امجھر شریف

---

۵ "اردو ہندی زبانیں" از پروفیسر حسن عسکری معاصر پٹنہ جلد ۲ حصہ ۶۔ اپریل ۱۹۵۴ء

تک کے سفر کے واقعات کو کتاب کی شکل میں مناقب محمدی کے نام سے لکھا ہے، اس کا قلمی نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کے کاتب سید غلام حیدر ہیں۔ اور اس کی کتابت ۱۲۴۲ء فصلی میں ہوئی ہے۔ کاتب کے الفاظ ہیں :۔ "از دست سید غلام حیدر تحریر گشت بتاریخ نوزدہم ربیع الثانی مطابق ہفتم ماہ بھادوں ۱۲۴۲ء فصلی"۔ مناقب محمدی میں مرقوم ہے کہ جب حضرت مخدوم سید محمدؒ اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانے لگے تو گوالوں کے نو مسلم سردار صادق کو بہت تعجب اور افسوس ہوا اور اس نے حضرت سے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے اس کو اسی کی زبان میں فرمایا۔ "نہ مانا جیو اینہا نر ہنا ہوا"، مناقب محمدی کی عبارت حسب ذیل ہے :۔

"ہمدریں صادق در رسید و گفت بسید ایں چنیں کو نشکہا آراستہ و پیراستہ گذاشتہ چرامی روی۔ او کہ ہندی بود و نیز فہم و فراست نہ داشت ازاں او را آنحضرت ہم بہ زبان ہندی ہمیں قدر فرمودند۔ "نہ مانا جیو اینہا نر ہنا ہوا"۔ ازاں روز نام آن جنگل و چشمہ نر ہنا افتاد"[1]

حضرت ابو الفیض قاضی بن علا بن عالم ترہتیؒ نے جو حضرت عبد اللہ شطاریؒ کے ۸۱۳ھ میں مرید ہوئے تھے۔ اپنے ملفوظات معدن الاسرار

[1] مناقب محمدی قلمی باب دوازدہم صفحہ ۵

میں حضرت مخدوم سید جلال بخاری المعروف بہ مخدوم جہانیان جہاں گشت کا ایک فقرہ نقل کیا ہے:۔

"کھندا ہے پھندا کہاں"

غرض میری ان صوفیائے کرام کے ملفوظات، دوہے، قالنامے وغیرہ کو پیش کرنے سے یہ ہے کہ میں اپنے مقالے کی عقبی زمین سے آپ کو روشناس کرادوں اور یہ واضح کردوں کہ اردو زبان کے اصل خالق ہمارے صوفیائے کرام ہیں جو اسلام کی تبلیغ اور روحانی سرچشموں سے عالم کو فیضیاب کرنے کے لئے ہمہ دم مصروف اور سرگرداں رہتے تھے۔ وہ گاؤں گاؤں پھر کر خدا کے بندوں کو اخلاق و مذہب کی باتیں بتانے اور ان کے دل سے برائیوں اور جہالت کی کثافتوں کو دور کرنے میں منہمک رہتے تھے وہ جس جگہ جاتے اور جن لوگوں سے ملتے ان سے ان ہی کی بولیوں میں اخلاق و مذہب کی باتوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ یہ عمل صدیوں تک ہوتا رہا اور اب وہی اردو کے قدیم نمونوں کی شکل میں ہمیں دستیاب ہیں۔

اب ہم صوبہ بہار سے تعلق رکھنے والے دو تین سو سال پہلے یعنی گیارھویں بارھویں صدی ہجری کے کچھ قدیم صوفی شعرا کو آپ کے سامنے پیش کریں گے جو گرچہ گمنام نہیں لیکن ان کے غیر فانی کلام اور تصانیف سے ہم کما حقہ، اس لئے آشنا نہیں کہ وہ زیادہ تر قلمی سفینوں، خاندانی بیاضوں کی شکل میں غیر مطبوعہ پڑے ہوئے ہیں۔ صوبہ بہار کی قدیم خانقاہوں میں اردو نظم و نثر کے بہت سے ایسے نادر نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ انھیں

دیکھ کر دل جھوم اٹھتا ہے۔

---

(۱) حضرت سیّد عماد الدین عمآد پھلواروی

پھلواروی شریف پٹنہ سے چھ سات میل پچھم صوفیائے کرام کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس کو حضرت منہاج راستی نے آٹھویں صدی ہجری میں قائم کیا تھا۔ حضرت عماد الدین عمآد اسی سلسلے کے ایک بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۰۶۵ھ میں ہوئی تھی اور وفات ۱۱۲۴ھ میں۔

آپ نے حصول تعلیم کے لئے دہلی اور لاہور جیسے دور دراز شہروں کا بھی سفر کیا تھا۔ انیس برس کی عمر میں آپ دہلی روانہ ہوئے اور وہاں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نبیرہ سے علمِ حدیث کی تکمیل کی۔ روحانی تربیت کے لئے آپ نے حضرت سید محمد فاضل قلندر سادھوری کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ اور سادھورے جا کر حضرت شاہ محمد فاضل قلندر سے بیعت حاصل کرنے کے بعد وہاں کچھ عرصہ تک قیام بھی فرمایا۔

مزید تعلیم کے لئے دہلی سے لاہور بھی تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور ہی کے ایک مدرسہ میں دو سال تک درس دیتے رہے۔

۱۱۰۲ھ میں پھلواری واپس ہوئے اور عبادت و ریاضت اور رشد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی تبلیغ مذہب اور تعلیم و تربیت خلائق رکھا۔ آپ فارسی اور اردو دونوں میں

قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ تالیف وتصنیف آپ کے مشاغل میں شامل تھا۔ عوام کی تعلیم اور فائدے کے لئے آپ نے اُردو میں کئی مذہبی رسالے بھی لکھے جن میں ایک سید ھارستہ منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ دینیات کا چھوٹا سا رسالہ ہے جس کا پتہ سب سے پہلے جناب تمنّا عمادی پھلواروی نے چلایا۔ یہ ان کو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سٹی کے کتب خانے سے ملا تھا۔ پھر اس کو قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے رسالہ معیار بابت ماہ مارچ ۱۹۳۶ء میں اپنے تعارف کے ساتھ مکمل طور پر شائع فرما دیا تھا۔ یہ رسالہ خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں اس کا سنہ تصنیف ۱۰۸۱ھ لکھا ہوا ہے۔ لیکن اپنے تعارف میں قاضی عبدالودود صاحب نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اپنے شکوک کا اظہار وہ اپنے تعارف میں اس طرح فرماتے ہیں :-

"کتاب[1] کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ بتایا گیا ہے۔ اگر مصنف کا سال ولادت ۱۰۶۵ھ ہے جیسا کہ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے تو ۱۰۸۱ھ میں مصنف کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ گیارھویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لئے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا۔ کتاب

---

[1] معیار پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء ص ۷-۶

کے خاتمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ناہل کی زندگی اختیار کرنے
کے بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ حالانکہ مصنف کے حالات
جو تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں ان سے یہ مترشح ہوتا ہے
کہ ناہل کا زمانہ ۱۰۸۱ھ کے بہت بعد ہوگا......... اگر
یہ واقعی گیارھویں صدی کا لکھا ہوا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہیے
کہ اس صوبہ میں نثر و نظم اردو کا اس سے قدیم تر نمونہ اس
وقت تک دستیاب نہیں ہوا۔"

قاضی صاحب کے یہ سارے شکوک بہت زیادہ وقیع اور وزن دار
نہیں معلوم ہوتے۔ صوفیا کا مقصدِ حیات ہی عوام تک پہنچ کر اُن کو اُن کی
زبان میں خدا اور رسول کی باتیں سمجھانا تھا۔ دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لئے
سب سے پہلے ہم زبانی ضروری ہے۔ آٹھویں صدی سے ہمیں بزرگانِ
دین کی یہ کوشش بہت نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔ قاضی صاحب اُردو
کے ایک بلند پایہ محقق کی حیثیت سے اس سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔
پھر تعجب ہے کہ ان کو ایک ممتاز صوفی خانوادہ کے ایک سولہ سالہ ہونہار
اور ذہین و فطین نوجوان سے عوام کی زبان میں ایک مذہبی رسالہ لکھنے پر
شک و شبہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی تصنیف میں
قاضی صاحب کے ان شبہات کو بہت وضاحت سے مدلل طور پر دور
کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ اختر
اورینوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"میرے خیال میں قاضی صاحب کے شکوک باوزن نہیں۔ پھلواری شریف میں ہندوستانی بولی کی طرف توجہ ابتداء سے تھی۔ دراصل صوفی خانوادوں میں تبلیغ حق اور ترویج اسلام کی لگن تھی اور اس غرض کے لئے عام بول چال کی زبان کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا جاتا تھا۔ کسی نہ کسی کو تو ابتدا کرنی ہی تھی۔ اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے حضرت عمادی ہی موسس اول ظاہر ہوتے ہیں پھر یہ کوئی انوکھی ریت نہ تھی۔ دکن میں صوفیائے کرام قدیم اُردو میں مذہبی رسالے تصنیف فرما چکے تھے۔ دوسرا شبہ عمر کے متعلق ہے۔ یہ بھی محض وہم ہے آپ کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غیر معمولی طور پر تیز طباع تھے۔ گھریلو زبان میں مذہبی معلومات کے متعلق مختصر سا رسالہ لکھنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ آج بھی سولہ سال کی عمر میں ذہین افراد ادب و شعر کی تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ تیسری بات تاہل کی زندگی کے متعلق ہے۔ اس میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں بھی بعض شادیاں ہو جاتی ہیں۔ اور آپ نے "حسب فرمائش اہل خانۂ خود" رسالہ صراطِ مستقیم معروف بہ سیدھا راستہ شادی کے بعد لکھا ہو .... ہر چند کہ

لہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء، صہ ۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳

رسالے کے خاتمے پر کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن
بقول جناب تمنّا پھلواروی یہ نسخہ حضرت شاہ وجہ اللہ
قلندر (سنہ ۱۸۲۰-۱۲۱۱ھ) خواہرزادہ حضرت شاہ نور الحق طپاں کی
پھلواروی کا لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ ان کے خط سے رسالہ
سید ھارستہ کا خط ملتا ہے۔

پھر جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پھلواری
شریف کے صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت اور تبلیغ
و ترویجِ اسلام کے لئے حضرت عمادؔ کے وقت سے مسلسل
اردو زبان کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضرت عمادؔ، سجادؔ
آیت اللہ جوہریؔ، نور الحق طپاںؔ، ظہور الحق ظہورؔ وغیرہم۔
لہٰذا اس سنہری زنجیر کی پہلی کڑی کے متعلق وہم و شک
میں مبتلا ہونا صحیح نہیں۔"

آپ نے دو صاحبزادے چھوڑے۔

نمونۂ تحریر کے طور پر رسالہ سید ھارستہ کے کچھ اقتباسات
درج ذیل ہیں۔

"امابعد پس جانو اے مسلمان بہنین اور بیٹی
سب کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ ان کے تئیں دھڑ بدن
اور پانوں ناکھ کان پیٹ پیٹھ کوچھ نہیں ہے۔ دھڑ بدن
مٹی سے بنیں ہیں۔ وے مٹی پانی آگ ہوا سب کے

تئیں تو آپی بنائن ہیں۔ آسمان زمین پاہاڑ ندی دریا
سب اون ہی بنائن ہیں۔ اون کے تئیں صورت بھی
نہیں ہے، مورت بدن کی ہووے ہے، جب اون کے
تئیں بدن نہیں تو صورت کیسے ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ کے
ایسا کوؤ نہیں ہے۔ اور نہیں ہو سکے ہے۔ اللہ تعالیٰ
کا کوؤ شریک ساتھی سگھاتی نہیں ہے۔ اَور نہیں ہو سکے
ہے نہیں ان کے تئیں کوؤ جنس ہے اَور نہیں ان سے
کسو کی تئیں جنس ہے۔ اون کے تئیں جورو جاتا بال بچہ
نہیں، نہیں دے عورت ہیں نہیں مرد، نہیں ہیجڑا نہیں
خنثیٰ، نہیں دے لڑکا ہیں، نہیں بوڑھا نہیں جوان۔
وے ہمیشہ سدا سیتی ہیں اَور سدا نلک رہیں۔ جیسے تھے
ویسے ہی ہیں۔ اور ویسے ہی رہیں۔ وے دیکھے ہیں
بنا آنکھ کے اَو سونتے ہیں بنا کان کے اور بولے ہیں
بنا موتھ اور زبان کے......"

یہ مختصر سا رسالہ سات چھوٹی چھوٹی فصلوں پر مشتمل ہے رسالہ
کا اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

"ان سب بات سیتی بچنا ہر مسلمان کے واسطے
فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد عورت کے تئیں نیک
کام کی توفیق دیویں اور ہر بورے کام سیتی بچا دیں

(۲) حضرت ملا محمد علیم تحقیقؔ

حضرت میر محمد علیم تحقیقؔ ۱۰۷۰ھ میں پیدا ہوئے اور بانوے برس کی عمر پاکر ۱۱۶۲ھ میں رحلت فرمائی۔ آپ میر بدیع الدین سمرقندیؒ عرف میر متین کے خلفِ رشید تھے انہوں نے شاہجہاں کا آخری زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اور عالمگیر کے عہد میں تو زندگی ہی بسر کی۔ یہ مرزا بیدلؔ، سجادؔ اور سید عماد الدین عمادؔ تینوں کے ہمعصر تھے۔ اور حضرت سجادؔ سے پہلے اور مرزا بیدلؔ اور عمادؔ کے بعد انتقال فرمایا۔

حضرت میر علیم تحقیقؔ نے مرزا معز موسوی خاں فطرتؔ سے اصلاحِ سخن لی تھی۔ میرزا فطرتؔ ۱۰۸۲ھ میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ وہ شہنشاہ عالمگیر کا وقت تھا۔ بادشاہ نے ان کی قدر و منزلت فرمائی اور انہیں عظیم آباد (پٹنہ) میں دیوانی پر متعین فرمایا۔ وہیں حضرت علیم تحقیقؔ کو مرزا فطرتؔ سے اصلاحِ سخن کا موقع ملا لیکن یہ اصلاح یقینی فارسی شاعری میں لی گئی ہوگی۔

حضرت میر علیم تحقیقؔ کی جائے پیدائش محلہ مغلپورہ عظیم آباد تھی آپ اس دور کے بڑے جید عالم تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں آپ کو دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ معقولات اور منقولات میں آپ کا علم و فضل بہت نمایاں تھا۔ فنِ موسیقی اور فنِ سپہ گری سے بھی واقف[۱] فارسی زبان کے بڑے قادر الکلام شاعر تھے اور ایک ضخیم دیوان اپنی

---

[۱] بہار اور اُردو۔ از جناب حمید عظیم آبادی ندیم بہار نمبر بابت ۱۹۴۱ء صہ ۱۵۶

اور اس فقیر عماد الدین کے تئیں جو شاہ برہان الدین کا
بیٹا ہے اور ان دونوں کے مائے باپ کے تئیں اور
سب مسلمان عورت جیتے موئے کون اپنی کرم سینی
بخشد یویں آور سب کے گناہوں سیتی درگذر فرمایں.
اور موئے پیچھے اپنے حبیب رسول کی شفاعت روزی
فرماویں آمین ثم آمین.

تمام ہوا یہ رسالہ صراطِ مستقیم معروف بہ سید ھارستہ
بتاریخ ۲۲ ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے سنہ ۱۰۸۱ھ ایک ہزار
اکاسی ہجری میں۔

رسالہ سید ھا رستہ کے مطابق آپ کے والد ماجد کا نام
حضرت شاہ برہان الدینؒ تھا.

بہار اور اردو شاعری میں راقم الحروف نے حضرت عمادؔ کا ذکر
کرتے ہوئے پھلواری خانقاہ کے ایک قلمی بیاض سے کچھ اشعار
نقل کئے تھے وہ درج ذیل ہیں : ؎

بیچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر بھی ٹک دیکھے کو ترساوے ہے

جب ستی چھوڑ سیں کھانا پینا تیرا دوانہ الفت میں
خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کھاوے ہے

آوے اپنے ہاتھ وہ موہن کھو نہیں عماد اب اس کی آس
اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں لاوے ہے

یادگار چھوڑا ہے آپ کی علمیت اور بزرگی کے باعث عظیم آباد کے امراء اور حکام بڑی عزت کرتے تھے۔ اور اپنی بغل میں مسند پر بٹھاتے تھے۔[۱] بالخصوص زین الدین خاں ہیبت جنگ کو تو ان سے بے حد عقیدت تھی۔ مصنف سیر المتاخرین نے ان کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

"میر محمد علیم کہ از مشاہیرؔ و مشائخ عظیم آباد از جملہ شاگردان مرزا معز موسوی خان فطرتؔ تخلص بود۔ شہرت علمش بسیار و شاعریش ہم اشتہار دارد"

حضرت تحقیقؔ کو سیاحت کا بھی ذوق تھا۔ دہلی اور بنگال کا سفر کیا۔ اور دہلی میں کچھ عرصے تک مقیم بھی رہے تھے۔ ہندوستان میں آپ کے بہت زیادہ شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ آپ کے ایک شاگرد لالہ اجاگر چند الفتؔ بھی تھے جنہوں نے آپ کی یہ تاریخ وفات کہی ہے۔ ع

"فرمود کہ تحقیقؔ شدہ واصل حق

۱۱۶۲ھ

آپ کے اردو کلام کم دستیاب ہوئے ہیں نمونتہً درج ذیل ہیں:۔

سر جن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن رہا ہے[۲] ۔۔۔ دیکھا ہوں جو تجھ مکھ کو نینا میرے چندھرائے ہے

جھگڑا باندھ کر دل موہن سماجا[۳] ۔۔۔ سلونو سانورے ایدھر کو آجا

---

[۱] نوائے وطن از شاد عظیم آبادی۔ [۲] بہار اور اردو شاعری از معین الدین دردائی ص ۱۵
[۳] بہار اور اردو ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء ص ۱۵۶

(۳) قاضی عبدالغفار غفاؔ

قاضی عبدالغفار غفاؔ سید عماد الدین عماؔد ان کے صاجزادے شاہ سجاؔد اور میر علیم تحقیق کے ہم عصر تھے۔ آپ پٹنہ ضلع کی ایک بستی رہوئی کے رہنے والے تھے. ان کی تصنیف جواہر الاسرار تصوف کی ایک نادر کتاب ہے. اس میں تصوف کے بہت سے اہم مسئلوں کو منظوم کیا گیا ہے. یہ کتاب ۱۱۱۶ھ کی تصنیف ہے. کتاب کے آخر میں مرقوم ہے:۔

> "تمام شد مسمی جواہر الاسرار تصنیف قاضی عبدالغفار در ۱۱۰۵ فصلی در ماہِ محرم بروز سہ شنبہ انصرام گردید۔ کاتب الحروف سید جمعیت علی برائے مطالعہ خود در ۱۲۳۶ فصلی۔"

یہ کتاب اردلی کاغذ پر خط شکستہ میں ہے. اس کی زبان اردوئے قدیم کے دورِ وسطیٰ کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب مجھے ۱۹۳۷ء میں دستیاب ہوئی تھی۔ میں اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے کا طالب علم اور علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر تھا. اسی سال مختصر مقدمہ کے ساتھ میں نے اس کتاب کو علی گڑھ میگزین میں شائع کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" میں اس پر بڑی تفصیلی بحث کی۔ اور میرے مقدمہ میں پیش کردہ بعض نظریات سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سی اہم حقیقتوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

"غفاؔ[۵۱] کے کلام میں صوفیانہ خیالات اور ہند کی بھگتی تحریک کا اثر نمایاں ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ایسی فضا بندھتی ہے کہ ہم عالم تخیل میں میراؔ، نام دیوؔ، نانکؔ اور کبیرؔ کی دنیائے جذبات میں پہنچ جاتے ہیں۔ دردائیؔ نے لکھا ہے کہ اس میں مگدھی زبان کا عنصر بہت زیادہ شامل ہے۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میرے خیال میں غفاؔ کی زبان ملی جلی زبان ہے۔ اس پر کھڑی بولی، اودھی اور برج بھاشا کا اثر بھی ہے۔ صرف مگدھی کا اثر نہیں۔ خود کبیرؔ کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ اس عہد کی صوفیانہ بھگتی شاعری میں ایک ایسی ملواں زبان مروج ہو چکی تھی جو کم و بیش خاک ہند کے بہت بڑے علاقے میں سمجھ لی جاتی تھی۔ میری رائے یہ ہے کہ غفاؔ کے کلام میں مگدھی عنصر نسبتاً کم ہے۔ اپ بھرنش ہی کے آخری دور میں مگدھی یا مگھی بھاشا کا زوال ہو چکا تھا۔ اس کی ادبی حیثیت گویا نہیں رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گریرسن کا بھی یہی خیال ہے۔ اس عہد کے معاً بعد اُردو زبان و ادب کا ارتقا ہوتا ہے۔ بہار کی قدیم اردو شاعری میں لسانی اعتبار سے مگہی بولی کا عنصر کم شامل ہوا ہے۔"

میں ڈاکٹر اختر اورینوی کی رائے سے اب متفق ہوں۔ غفاؔ کے کلام کا

۵۱۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۱۱-۲۱۰

بہ نظرِ غائر تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غفاؔ کی زبان پر کھڑی بولی اودھی اور برج بھاشا تینوں کا اثر ہے مثلاً :- جیو ، پیو ماٹی ، برج بھاشا کے الفاظ ہیں۔

دیکھیا ، پایا ، آیا ، لے گیا ، آئے ، دیکھا ، بھلایا ، دھرا ، بھیجا ، رہا۔ کھڑی بولی کے افعال ہیں۔

اسی طرح موں ، کا ، توں ، موئے ، دھوئے ، جائے اودھی اور پوربی الفاظ ہیں۔ اب ہم جگہ جگہ سے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کریں گے :-

وجودِ باری سے متعلق اشعار :-

۱۔ پہلے اتے پیہ تھا اور نہ تھا سن کوئے — پیہ پیارے کے جوت ہے جو کچھ پرگھٹ ہوئے
(روشنی ، ظاہر)

۲۔ سائیں پرگھٹ آپ ہے جگ موں غیر نہ ہوئے — سن جو کہے الکھ کوں بلی کہے بھی سوئے
(ہیں ، اپاہج ، اللہ ، پہلوان ، وہی)

وحدت الوجود سے متعلق اشعار :-

۳۔ بولے کبھوں الفہا اتے اپنے ساتھ — ارنی کہے پہاڑ پر عاصا پکڑے ہاتھ

۴۔ کریں تجلی طور پر پھر آپے موسیٰ ہوئے — اپنے چھب او جوت کوں دیکھ کرے سدھ کھوئے

۵۔ کبھوں آذر کھس سین پاتھر پوجی جائے — کبھوں روپ خلیل کے نورت بہور آئے
(جھلک ، تو ، روشنی جلوہ ، ہو ، آتش)

۶۔ کہے غفاؔ سنسار موں دیکھا دیس بدیس — سائیں آپی آپ کوں سیوائے مانگ بھیس

۷۔ جب سین چاہا پیہ نے دیکھے اپنے جوت — انگنتے کے روپ میں جگ موں پر گھٹ ہوئے

۸۔ پیہ کا روپ اپار ہے پر گھٹ کنا نہ ہوئے — اور نہیں جب ایک ہے ہوئے کہاں تب دوئے

اللہ کی نہ صورت ہے نہ رنگ :-

۹۔ جگ اندر سبھ رنگ ہے جوں تجھ پوچھے کوئی — سائیں آپ نرنگ ہے واکوں رنگ نہ ہوئے
(اس کو)

۱۰. جاکوں صورت کچھ نہیں اور رنگ نہ ہوے جاہ — ادہی ظاہر جگ بھیا یہ کچھوں کہیہ تاہ
(کس طرح)

حادث اور قدیم پر اظہار رائے :۔

۱۱. غفا سمندر قدم کا پل پل ہرے لیت — سبھ ہروں کو کھینچ کے آپ ناتھ بھر دیت

عشق کی اہمیت :۔

۱۲. آگ پڑے تن پیم کے جل بل بوجھا جیو — کہے غفا تم آگ مون دے جیو پایا پیو
۱۳. غفا سمندر پیم کا دیکھا غوطہ مار — جو نِھے موتی بھید کے آئے ہمارے ہاتھ
۱۴. اٹھ پردیسی کیا سوانین پیم جل دھوئے — دور گئے سبھ سنگ کے توں رہا اکیلا ہوئے
۱۵. تن کا نا بنا اگ مون پانی کرے جو کوئے — ڈارے بوٹی پریم کی تب جلے کنچن ہوئے
۱۶. پیم پنتھ مون ایک ہے سن مسجد اور دبر — جب دیکھا تب پیا کون نین نہ آیا غیر
(مجبورک)

فنا فی اللہ یا بیخودی کی تلقین :۔

۱۷. کہے غفا جنھ آپ بھلایا — تن سائیں کا درشن پایا
۱۸. بھیجا پوتھی پریم کی نانوں دھر اقرار — مانک ماتھ سمائے کے آپی مانجے آن
(آدمی میں)

شرک کی تعریف :۔

۱۹. کہے غفا جنھ دیکھا دوئی — پیم پنتھ مون مشرک ہوئے

خدمت خلق کی ترغیب :۔

۲۰. لوگ باورے پیہ کون ڈھونڈیں دیس بدیس — پیہ ہر گھٹ جگ ماتھ ہے آپے مانک بھیس
(خدا بندوں میں موجود ہے)

حضرت غفا کے سوانحی حالات سے پوری طرح واقفیت نہ ہو سکی۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں رہوئی کے پرانے اور ضعیف العمر لوگوں سے کچھ حالات معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ رہوئی پٹنہ ضلع میں سادات اور ذی علم لوگوں کی بہت بڑی بستی تھی۔ ادھر پچاس ساٹھ سال سے ان پر ویرانی ہے۔ بہت جستجو کے بعد اتنا پتہ چل سکا کہ حضرت قاضی عبد الغفار غفاؔ سلسلہ فردوسیہ کے ایک ذی علم صوفی اور بزرگ تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

---

(۴) حضرت غلام نقشبند سجادؔ

حضرت سجادؔ حضرت خواجہ عماد الدین عمادؔ پھلواروی کے صاحبزادے اور حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواری کے داماد تھے۔ سنہ ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۷۳ھ میں وفات پائی۔ حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی خواجہ عماد الدین عمادؔ کے ماموں زاد بھائی مرید اور خلیفہ بھی تھے۔ جب خواجہ عماد الدین عمادؔ کا وصال ہوا اس وقت حضرت سجادؔ کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ بڑے ہونے پر آپ کی شادی شاہ مجیب اللہ رح کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ آپ ایک ذی علم بزرگ تھے۔ اور فارسی اور اردو دونوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا اردو کلام رسالہ معاصر پٹنہ بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء میں بھی چھپا ہے۔ حضرت سجادؔ اور عمادؔ کے کلام مخطوطات کی شکل میں صرف پھلواری شریف ہی میں دستیاب ہیں۔ باہر کی کسی لائبریری وغیرہ میں نہیں ملتے۔ اس لئے بعض لوگوں

کے دل میں ایسا وسوسہ گذرتا ہے کہ یہ سب کلام الحاقی اور جعلی تو نہیں۔ لیکن یہ محض وسوسہ ہی ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر حسن عسکری نے اس بارے میں کافی چھان بین کے بعد اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ سجاد کا کلام اصلی ہے۔ صوبہ بہار کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب بھی سجاد کے کلام کے اصلی ہونے سے مطمئن ہیں۔
ڈاکٹر اختر اورینوی نے اس بارے میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے۔

"پھلواری کے صوفیا کے کلام ہرگز الحاقی نہیں اگر تذکروں میں ان میں بیشتر کا ذکر نہیں تو یہ تذکرہ نگاروں کی نارسائی ہے۔ اب جو مخطوطات اور مسودات ہمارے سامنے آرہے ہیں تو حقائق پر سے پردے اٹھ رہے ہیں۔ داخلی شہادت بھی کوئی ایسی نہیں جس کی وجہ سے ہم انہیں جعلی یا الحاقی سمجھیں۔ ان بزرگوں کے کلام کو حضرت نورالحق تپاںؔ پھلواروی کے علاوہ حضرت شاہ نعمت اللہ (۱۱۶۰ھ تا ۱۲۴۵ھ) پھلواروی نے بھی مرتب کیا ہے قدیم منقولات بھی موجود ہیں اور بعد میں ان قدیم منقولات سے نقلیں ہوئی ہیں۔

نمونہ کلام درج ذیل ہے:۔[۱]

(۱)

ہائے زمین سخت ہے دور ہے آسمان بھی | دم بھی گھوٹے ہے غم ستی نکلے نہیں ہے جان بھی

---

[۱] بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ص ۲۲۲

ایسے ہی غیروں کے تئیں کہہ دیو اپنے جان نثار
لاوو گے قتل گر کے بیچ لیو گے امتحان بھی

بیچ تمہارے جمع ہے رنگ جلال وہم جمال
آنکھ ستی ستم شعار دل ستی مہربان بھی

ہووے جو اختتام وہ جب کہیں ہوئے یہ بھی ختم
قصہ عمر پر رہا ہجر کا داستان بھی

آج وہ اپنے گھر ستی نکلے ہیں فاتحہ پڑھے
جبکہ نہ میری قبر کا باقی رہا نشان بھی

ہووے ہزار جی پہ غم شرط وفا یہ ہے مگر
آنکھیں بھی خشک ہی رہیں بند رہے زبان بھی

تم ہی تو ہماری جان تم ہی ستی تو ہے جہان
کیونکہ نہ ہم مناویں خیر جان ہے تو جہان بھی

جی کے تئیں دبا کے واں جاویں کسو طرح سے پر
منہ ستی اون کے روبرو ہو سکے ٹک بیان بھی

سجدہ گذار آستاں تیرا غلام نقشبند
رحم کا خواستگار ہے رحم ہے تیری شان بھی

(۲)

بیداد کون جانے ہے بیداد کے تئیں
صیاد مت کہو مرے صیاد کے تئیں

گلچیں سے بڑھ کے جانے نہ صیاد کے تئیں
اتنا جتا دو مرغ چمن زاد کے تئیں

جنت ہی کی ہوس نہ تھی آخر وہ شیخ جی
دوزخ میں جو کہ لے گئی شداد کے تئیں

آسان نہیں تجھ ایسے کی تصویر کھینچنی
آئینہ گر نہ دیوے یہ بہزاد کے تئیں

غم خوش رہے کہ ایک یہی تو فراق میں
رکھے ہے شاد خاطر ناشاد کے تئیں

کیسے ہو آج کوئی مسلمان دیندار
جب لوگ دین سمجھے ہیں الحاد کے تئیں

ہیں طفل اشک مردم دیدہ کے نور چشم
ٹپکے ہے کون خاک پہ اولاد کے تئیں

عارض گلاب زلف ہے سنبل تو نرگس آنکھ
گلشن ہی ہم تو پاویں ہیں صیاد کے تئیں

طوفان اشک اور جوانی کی ناؤ ہائے
سمجھا دو ٹک کوئی مرے سجاد کے تئیں

(۳)

جب موسم گل آن کے تائید کرے ہے	تب جوش جنوں عقل کی تردید کرے ہے

پرویز و نل و کوہکن و وامق و مجنوں	جو ہے وہ مری بات کی تقلید کرے ہے

اٹھے گا یہاں پھر نہ کبھی شور تمنا	دل بیچ یہی یاس اب امید کرے ہے

جو بیچ محبت کے فنا ہووے ہے اے دل	حاصل وہی تو ہستیٔ جاوید کرے ہے

جس روز کہ پہونچے ہے نئی کوئی مصیبت	اس روز ترا خوگر غم عید کرے ہے

رکھے ہے جبیں در پہ ترے گنبد گرداں	سجدہ ترے دروازے پہ خورشید کرے ہے

گرد سم رہوار ترا پہونچے ہے جس جا	ہیبت سے وہاں خنگ قمر لید کرے ہے

قاصد کے تئیں چاہیئے کہدے جو کہن ہے	کیوں اپنی طرف سے کوئی تمہید کرے ہے

سجّاد جو سمجھا ہے خود اپنے تئیں موجود
وہ فہم نہیں معنیٔ توحید کرے ہے

(۴)

ہجر کی رات بہت بھاری ہے	عشق کی بات بہت بھاری ہے

بھیج دیویں نہ کلیجہ اپنا	یہ ہی سوغات بہت بھاری ہے

الٹی جاوے ہے بساط دل اب	ایسی تو مات بہت بھاری ہے

نامہ شوق کا آیا یہ جواب	اب ملاقات بہت بھاری ہے

نفی کے بعد سے اثبات صحیح	خالی اثبات بہت بھاری ہے

کل جو بوجھا تھا بہت ہی ہلکا	آج ہیہات بہت بھاری ہے

خوگر غم کے تئیں بھی سجّاد

غم مافات بہت بھاری ہے

(۵)

جو گھڑی جاوے گذر دمئے و جام کے بیچ
ہے بہ از عمر خضر گردش ایام کے بیچ

خوگر غم کے تئیں یاد بہت آوے ہے
لمحہ رنج جو تھا مدت آرام کے بیچ

بیچ اون انکھڑیوں کے ایسے ہے ایسی مستی
موج مئے جوش کرے جیسے کبھو جام کے بیچ

مجھ ستی سن لے ارے نام و نشاں کے طالب
بے نشانی ہی رہے ہے ہوس نام کے بیچ

یاس کے بیچ وہ گھل مل کے ہوئی یاس کے رنگ
کوئی حسرت جو رہی ٹک دل ناکام کے بیچ

دل ہی جانے ہے جو ہوتے ہیں گداخاص ان کی
عالم جلوہ فروزی میں سر بام کے بیچ

جب ستی اوس بت خود کام ستی کام پڑا
جی نہیں بہلے ہے سجاد کسو کام کے بیچ

(۶)

میاں خدا کو پاوے کوئے
جب خود کو یا خودی کو کھوئے

ہوش و خرد رکھے جو کوئے
تجھ مکھڑے پر عاشق ہوئے

جی جو نہ دکھتے کا ہے کوئے
بیٹھا بیٹھا سسکے روئے

دنیا ہے عقبیٰ کا کھیت
وہ کاٹے دہقاں جو بوئے

خاک آوے عاشق کے نیند
دل تڑپھے تو کیسے سوئے

ہم تو کیا جو کرے کو تھا
اب صاحب جو ہوئے سو ہوئے

تمرے تئیں بھی ہووے عشق
تب بتلا دو کیسا ہوئے

قطعہ

پڑھے عاشق جب کہ نماز — دیر طرف منہ اوس کا ہوئے
بیچ وضو کے جی ستی ہاتھ — آنسو ستی وہ منہ کو دھوئے

نالہ تم کھینچو سجاد
اب چاہے کچھ ہوئے نہوئے

(۷)

مری حسرتیں دل میں گھبرانیاں ہیں — نکلنے کی راہیں نہیں پاتیاں ہیں
تری مست آنکھوں کی یہ پتلیاں تو — تماشا قیامت کا دکھلاتیاں ہیں
اُدھر بدلیاں ہیں اِدھر میری آنکھیں — وہ پانی تو یہ اشک برساتیاں ہیں
صلاح اپنی آنکھوں کی اے دل نہیں کیا — کوئی کام کی بات بتلاتیاں ہیں
خدارا بتا دیں تو ٹک ہم کو سانسیں — کہاں آتیاں ہیں کہاں جاتیاں ہیں
ارے یاس یہ حسرتیں ہیں جو میری — ترا نام سن سن کے گھبراتیاں ہیں
بنیں جو کہ تیر بلا کا نشانہ — فقط اہل دل ہی کی وہ چھاتیاں ہیں
سر بزم دکھلا دیں ہیں بسکہ شوخی — وہ آنکھیں جو خلوت میں شرماتیاں ہیں
امیدیں جو مہمان ہیں میرے دل میں — لہو پیتیاں ہیں جگر کھاتیاں ہیں
سنتا ہوں کہ اکثر نگاہیں تمہاری — مرے قتل کے بعد پچھتاتیاں ہیں

موا جائے سجاد ہے جن کے غم میں
وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آتیاں ہیں

(۸)

کہیں کو چلا گیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجاد ستی — نظارات تلک تو کام اوس کو اشغال ستی اور ادستی

ٹک میری طرف سے بادِ صبا جا کر کہہ صیاد ستی
اب جان لبوں پر بلبل کے پہونچی ہے تری بیداد ستی

تنہائی فرقت میں کیا کیا اپنا نہ یہ دل گھبراوے ہے
بہلے ہے جو ٹک یہ ناشدنی تو صرف تمہاری یاد ستی

جب آگ دہن گیتی ہو اس پر مت چھیڑو تیل صراحی تم
کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو اے یارو اک ناشاد ستی

اے بادِ سحر لے موجِ صبا لے جلد ہماری آ کے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی

سن پایا ہے اس نے دل میرا کعبہ ہے گھر اللہ کا ہے
اب کھود کے اس کو پھکوا دے وہ بت نہ کہیں بنیاد ستی

جو دیکھ کے ہم کو ہاتھ ملے پچھتاوے اور افسوس کرے
بتلا دو کوئی کریں شکوہ کیا ایسے ستم ایجاد ستی

ٹھانا تو بہت اب جاویں گے ہرگز نہ کبھو کوچے میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد ستی

توڑا ہے وہ کب کا تقوی کو بھٹی میں تو اس کی گذرے ہے
سجادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو کچھ سجاد ستی

(۹)

سمجھاؤں ہوں یہی دل ناکام کے تئیں
آغاز بیچ سونچ لے انجام کے تئیں

چرخ بریں فرود ہے زینے ستی ترے
بولیں ہیں عرش لوگ ترے بام کے تئیں

کیا جاوے گا بگڑ کہیں قدرت کا ہاتھ تک
دیوے پلٹ جو گردش ایام کے تئیں

سودا کرے ہے غم کا جو بازار عشق میں
سو دکھ کے بھاؤ بیچے ہے آرام کے تئیں

واعظ سنا دے سدرہ و طوبیٰ کی گفتگو
ہم چاہیں اپنے سرو گل اندام کے تئیں

بولے ہے شیخ مجھ ستی ساقی کو کہہ دو تم
ایدھر کو بھی بڑھا دے کبھو جام کے تئیں

زاہد کرے ہے کعبہ میخانہ کا جو حج
رنگے ہے مے میں جامہ احرام کے تئیں

بھاوے نہیں ہے شیخ کی صحبت یہ میکشو
بیٹھا دو ساتھ مت کسو بدنام کے تئیں

سجاد کا ہے کھینچے ہے تو آہ نارسا

توڑے ہے کوئی بھی ثمر خام کے تئیں

(۱۰)

جب چال چلے انڈ لاوے ہے
جب بولے تب اتراوے ہے

میں دل کو یوں سمجھا دوں ہوں
گھبراوے مت وہ آوے ہے

اندھیارے میں جگ مگ جگ مگ
کچھ دور ستی دکھلاوے ہے

جی دیوے کا ہے بھوک ستی
عاشق بیٹھا غم کھاوے ہے

اک دم پیلا ہڈی ہڈی
پہچان بھی کوئی پاوے ہے

فرقت بھی ترے دیکھا دیکھی
اب میرے تئیں تڑپھاوے ہے

بن بن جو پھرے مارا مارا
سجاد وہی کہلاوے ہے

(۱۱)

یہ بولے کیا کہہ رہے ہے گھر میں بھی کوئی کہ نہیں
ملے حضور سے اب در میں بھی کوئی کہ نہیں

جنوں عام ہے ایسا بہار سے پوچھو
کہ رہنے پاوے گا اب گھر میں بھی کوئی کہ نہیں

تھی اوس کے فوج بھی نوکر بھی اور چاکر بھی
گیا مزار سکندر میں بھی کوئی کہ نہیں

سنا تو وامق و فرہاد و قیس کے قصے
موا ہے عشق پیغمبر میں بھی کوئی کہ نہیں

اڑے جہان میں لاکھوں کے مرغ جان لیکن
ہے دام زلف معنبر میں بھی کوئی کہ نہیں

غریب جان کے سجاد کو جو مارے ہو
تو تم سے پوچھے گا محشر میں بھی کوئی کہ نہیں

---

(۱۲)

زہد ریا سے زاہد توبہ نہیں کرے ہے
ناداں اپنے حق میں اچھا نہیں کرے ہے

کچھ بن کہیں پڑے ہے دل کی ہوس کے آگے
اپنے تو جانتے یہ کیا کیا نہیں کرے ہے

یوں ڈوبتا جو ہووے دریا کے بیچ کوئی
تیراک بیٹھا بیٹھا دیکھا نہیں کرے ہے

ہو جاوے ہے محبت خود اپنے آپ ناصح
کوشش سے تو کوئی پیدا نہیں کرے ہے

سجاد یاد آیا تو بیٹھے بیٹھے بولے
اب کوئی در پہ آکے رویا نہیں کرے ہے

قطعہ

صدقے ترے ساقیا آج لگادے سبیل
وارد میخانہ ہے زاہد پرہیزگار

آپ الگ ہیں خفا دل ہے جدا بے کہا
آپ ہی ٹک سوچئے کیا کرے سجاد زار

(۵) حضرت بی بی ولیہ

حضرت بی بی ولیہؒ بڑی ذی علم اور پاکباز خاتون تھیں۔ آپ کے والد کا نام سید شاہ عزیز الدین اجھری تھا۔ آپ کی شادی شاہ مخدومؒ سے ہوئی تھی جن سے حضرت شاہ آیت اللہ جوہری ہوئے۔ آپ کی بزرگی اور مکاشفات کے اس زمانہ میں بہت چرچے تھے۔ اور ان میں سے کچھ واقعات تحریری شکل میں پھلواری شریف کے بعض ذاتی کتب خانوں میں آج بھی

موجود ہیں۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر بڑی اچھی دستگاہ رکھتی تھیں۔ فارسی اور اردو کی قادر الکلام شاعرہ تھیں۔ تصوف پر بھی بڑی اچھی نظر تھی۔ اور اس دور کے صوفیائے کرام میں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ "بہار اور اردو شاعری" میں بھی میں نے ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے ۱۹ر جمادی الاول ۱۱۳۹ھ کو آپ کا وصال ہوا۔

حضرت مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی قدس اللہ سرہٗ کی شان میں ان کا ایک مشہور قصیدہ فارسی میں ہے جس کا مطلع ہے :

ندانم کہ در روز محشر چہ باشد
کہ جرم و گناہم گذشت است از حد

اردو میں ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے :

کون ستی تدبیر بناویں ۔۔۔ اون اپنے کن ہم کو بلاویں
حضرت کی ڈیوڑھی جو پاویں ۔۔۔ سیر جھکا کے آنکھ لگاویں

---

(۶) حضرت سیّد فضل علیؒ

حضرت فضل علیؒ موضع رہوئی سب ڈویزن بہار شریف ضلع پٹنہ کے ایک عابدؔ زاہد اور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام سیّد کرم علی تھا آپ کا نسب نامہ اس طرح ہے۔

سیّد فضل علی بن سیّد کرم علی بن سید سیف الدین بن سید محمد امین بن سیّد معصوم معروف بہ مرشد بنگالہ بن سید مخصوص بن سید جان

بن سید زیبا بن سید خاند بن سید خوند بن سید بڑے بن سید سالار بن سید خضر الدین بن سید مبارک بن سید علی شیر بن سید علی اکبر بن سید علی اصغر بن سید عبداللہ بن سید علاؤ الدین بن سید محمد شہید بن سید نوح بن سید ابراہیم بن سید عبدالرزاق بن سید عبدالمطلب بن سید یوسف بن سید امام حسن بن سیدنا امام موسیٰ رضا علیہ السلام بن سیدنا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بن سیدنا جعفر صادق علیہ السلام بن سیدنا امام باقر علیہ السلام بن سیدنا امام زین العابدین علیہ السلام بن سیدنا حسین علیہ السلام شہید کربلا بن سیدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام بن ابی طالب علیہ السلام"۔

حضرت سید فضل علی چار بھائی تھے۔ سید فضل علی خود، سید افضل علی سید جمیعت علی اور سید معصوم علی۔ یہ چاروں مسماۃ بی بی فاطمہ کے بطن سے تھے جو سید کرم علی صاحب کی پہلی بیوی تھیں۔

سید فضل علیؒ کی شادی مسماۃ بی بی واصلہ سے ہوئی تھی جن سے ایک صاحبزادے سید ابوالقاسم کا پتہ چلتا ہے۔ منجھلے اور چھوٹے بھائی سید افضل اور سید معصوم علی کا حال نہیں معلوم سنجھلے بھائی سید جمیعت علیؒ جو راقم الحروف کے جدِ اعلیٰ تھے، کی شادی موضع سرتھوا ارجن ضلع پٹنہ سید فضل اللہ کی صاحبزادی مسماۃ بی بی مدینہ سے ہوئی اور وہ سرتھوا ہی میں مقیم ہو گئے۔ اور ۱۲۳۹ فصلی میں وفات پاکر یہیں سپرد خاک کئے گئے۔ سید فضل علیؒ کو حضرت منعم پاکؒ سے بیعت حاصل تھی۔

سید فضل علیؒ کی پیدائش اور وفات کا صحیح پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن آپ کے والد سید کرم علیؒ کی تاریخ وفات راقم الحروف کی خاندانی بیاض میں ۱۱۷۲ فصلی تحریر ہے۔ اور حضرت فضل علیؒ حضرت کرم علی کی پہلی بیوی سے سب سے بڑے فرزند تھے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

آپ کی ایک اردو مثنوی ہیر رانجھا مجھے حاصل ہوئی ہے۔ یہ مخطوطہ بسم اللہ سے تمت تک بالکل مکمل ہے۔ اس کی کتابت اردلی کاغذ پر خط شکستہ میں کی گئی ہے۔ اس مثنوی کے کل پینتیس ۳۵ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ نو انچ لمبا اور چھ انچ چوڑا ہے۔ ہر صفحہ میں سطروں کی تعداد مختلف ہے بعض میں دس بعض میں پندرہ بعض میں سولہ بعض میں سترہ اور صرف ایک میں اٹھارہ کل اشعار کی مجموعی تعداد چار سو پچاسی ۴۸۵ ہے۔

مثنوی ہیر رانجھا جہاں پر ختم ہوئی ہے وہاں سے مصنف نے "قصہ دیگر" لکھ کر ایک دوسرا قصہ نظم کیا ہے جو خالص صوفیانہ رنگ میں نصیحت آمیز طور پر لکھا گیا ہے۔ اس منظوم قصہ کی مجموعی تعداد سینتالیس ۴۷ شعر ہے۔

یہ مثنوی بحر ہزج مسدس میں لکھی گئی ہے جس میں محذوف اور مقصود کے زحافات ہیں۔ (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل)

زیر بحث مثنوی ہیر رانجھا کے سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا لیکن اس مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:۔

"تاریخ سوم ماہ فروری ۱۸۱۹ء مطابق بسنت پنجم ماہ ماگھ ۱۲۲۶ فصلی موافق ہفتم ربیع الثانی ۱۲۰۳ھ نبوی

روز چہار شنبہ بوقت گذشت یک پاس شب بہ مقام
قصبہ صاحب گنج بہ خط خاالنخلان بندہ شیخ محمد افضل
مالک موضع مقصود پور ادگانواں صوبہ بہار ضلع بہار تھانہ
بہار۔ اولی نقل از خاص کتاب فضل علی مصنف است۔"

مندرجہ بالا عبارت سے کئی باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ
کہ اس نسخہ کے کاتب شیخ افضل مالک مقصود پور ادگانواں ہیں جو موضع رہوئی
سے بہت قریب ہے۔ قیاس غالب ہے کہ کاتب نسخہ ہذا شیخ افضل صاحب
سید فضل علی درؔ کے مخصوص دوستوں میں ہوں گے۔ اور یہ دونوں ایک مرتبہ
اور ایک مشرب کے بزرگ ہوں گے۔ تیسرے یہ کہ یہ نسخہ مصنف کی کتاب
خاص سے نقل کیا گیا ہے اور اس سے پہلے کوئی نقل اس مثنوی کی نہیں ہوئی
ہے جس سے تصنیف کی قربت زمانی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ نتیجہ نکالا جا
سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۱۹ء (جو اس مثنوی کی سنہ کتابت ہے) سے کچھ سال پہلے
یہ مثنوی نظم کی گئی ہوگی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و
ادب کا ارتقا" میں "بہاری ریختہ" کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا اردوئے قدیم
جس میں ریختہ پن کے ساتھ کچھ لسانی پنجابیت بھی ملتی ہے۔ دوسرا عہد وسطیٰ
جس میں بہاری ریختہ کھڑی بولی سے بہت زوروں پر متاثر ہو رہی تھی۔
تیسرا معیاری عہد جس میں کھڑی بولی بہار کے اردو ادب پر چھائی ہوئی
معلوم ہوتی ہے۔ زیر بحث مثنوی ہیر رانجھا اسی معیاری عہد کی تصنیف

معلوم ہوتی ہے۔

زیر بحث مثنوی ہیر رانجھا میں وہی مشہور قصہ ہے جو غالباً سب سے پہلے پنجابی زبان کے مشہور شاعر وارث شاہ نے نظم کیا تھا اور جس کی مقبولیت ایسی ہوئی کہ شاید ہی پنجاب میں کسی قصہ کی کتاب کی ہوئی ہو۔ پھر پنجابی سے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ حضرت فضل علیؒ کی ہیر رانجھا اور وارث شاہ کی ہیر رانجھا میں قصہ کے لحاظ سے جہاں یکسانیت پائی جاتی ہے وہاں پلاٹ کے لحاظ سے کئی جگہ دونوں میں فرق بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً دونوں نے قصہ کا آغاز تخت ہزارہ سے کیا ہے۔ دونوں نے رانجھی (ہیرو) کے بانسری بجانے کے شوق اور فنی کمال کا ذکر کیا ہے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ رانجھا کو ہیر (ہیروئن) سے ملانے میں ہیر کی نند سہتی کا ہاتھ تھا جس نے اپنی بھاوج کو چالبازی سکھائی کہ جھوٹ موٹ سانپ کلٹے کا مکر کچھائے۔ اور اس کے ایسا کرنے پر سہتی نے رانجھا کو جو جوگی بنا "کالے باغ" میں تھا، جھاڑنے کے لئے بلوا بھیجا اور اسی وقت یہ دونوں وہاں سے نکل بھاگے۔ لیکن اس موقع پر وارث شاہ نے ہیر کی نند سہتی کو بھی اس کے عاشق مراد بلوچ کے ساتھ فرار ہوجانے کا ذکر کیا ہے اور آگے جب کھیڑے اُن کے تعاقب میں نکلے تو سہتی اور مراد تو نہ پکڑے گئے لیکن ہیر پکڑ گئی۔ حضرت فضل علیؒ کی ہیر رانجھا میں یہ واقعہ نہیں مذکور ہے۔ پھر حضرت فضل علیؒ نے لکھا ہے کہ رانجھا خواب میں ایک حور پیکر نازنین کو دیکھتا ہے اور اس پر عاشق ہوجاتا ہے۔ نیند سے بیدار ہو کر

دریا کی طرف دیوانہ وار جاتا ہے۔ وہاں اتفاق سے ایک کشتی کھڑی ملتی ہے جس پر سوار ہونے سے اس کی ملاقات ہیر سے ہوتی ہے اور وہی اس کے خواب کی محبوبہ نکل آتی ہے۔ لیکن وارث شاہ نے اس کو دوسری طرح لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جھنگ سیال کا ایک آدمی تخت ہزارہ آیا اور رانجھا کا مہمان ہوا۔ باتوں باتوں میں اس نے جھنگ سیال کی عورتوں کے حسن وجمال کی ایسی تعریف کی کہ رانجھا کو اس دیس کی عورتوں کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور وہ ایک دن روانہ ہو گیا۔ راستہ میں جس کشتی سے اس نے دریا پار کیا اس پر ہیر کا پلنگ بھی لایا جا رہا تھا۔ رانجھا مسلمان تھا اور ہیر کا باپ غیر مسلم جھنگ سیالوں کی قوم کا سردار تھا۔ کسی نے ہیر سے شکایت کر دی کہ اس کا پلنگ کسی فقیر نے خراب کر دیا وہ غصہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریا کنارے پہنچ گئی اور مارنے کے لئے رانجھا کو ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی "کیوپڈ" کا تیر دل کے پار ہو گیا۔ اور وہ اس کی گھائل ہو گئی۔ وارث شاہ کا پلاٹ زیادہ فطری اور حقیقت سے قریب ہے۔ اور اسی لئے حد درجہ پُر تاثیر بھی ہے۔

حضرت فضل علیؒ نے ہیر اور رانجھا دونوں کے فرار ہونے کے بعد قصہ کو ختم کر دیا ہے لیکن وارث شاہ نے اس کے آگے ہیر کا پکڑا جانا پھر وہاں کے راجہ کے فیصلہ کے مطابق ہیر کو رانجھا ہی کے حوالے کیا جانا۔ بعدہٗ ہیر کو لے کر رانجھا کا جھنگ (یعنی ہیر کے گھر) واپس آنا بھی

لکھا ہے اور قصہ کا خاتمہ اس طرح کیا ہے کہ ہیر رانجھا کے جھنگ آنے کے بعد سیالوں کی جب بہت زیادہ بدنامی ہونے لگی تو ان لوگوں نے رانجھا سے کہا کہ تم اپنے گھر ہزارہ سے باضابطہ بارات لاؤ اور ہیر کو بیاہ کر لے جاؤ۔ ادھر رانجھا بارات لانے کا انتظام کرنے کے لئے اپنے گھر روانہ ہوا اور ادھر سیالوں نے ہیر کو زہر کا پیالہ پلا کر مار ڈالا اور رانجھا کو اس کی موت کی اطلاع کر دی۔ جیسے ہی رانجھا کو ہیر کے مرنے کی خبر ملی وہ ایک چیخ مار کر گرا اور مر گیا۔ حضرت فضل علی کی ہیر رانجھا پلاٹ کے لحاظ سے وارث شاہ کی ہیر رانجھا سے بلاشبہ کمتر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ آخری حصہ جس کے بغیر پلاٹ میں رومانیت اور اثر پید انہیں ہو سکتا حضرت فضل علیؒ نے اپنی مثنوی میں کیوں چھوڑ دیا۔ قیاس کہتا ہے کہ فضل علیؒ کے پیش نظر وارث شاہ کی مثنوی ہیر رانجھا کا کوئی نسخہ اس مثنوی کے نظم کرنے کے وقت نہیں رہا ہوگا۔ بلکہ انہوں نے محض اپنی یادداشت پر بھروسہ کر کے مثنوی زیر بحث لکھی ہوگی۔

ان دونوں کی ہیر رانجھا میں ایک اور بنیادی فرق جو معلوم ہوتا ہے وہ نظریہ کا ہے۔ وارث شاہ کے پیش نظر اس مثنوی سے عوام میں ایک عشقیہ داستان کو پیش کر کے اُن کے رومانی مذاق اور تفریحی شوق کو سیراب کرنا ہے۔ اس کے برعکس حضرت فضل علیؒ کے سامنے عوام کو قصہ کہانیوں کے ذریعہ تصوف کے بعض رموز اور پند ونصیحت سے متعارف کرانا ہے اُن کا دھیان پلاٹ کی دلچسپی سے زیادہ اس مقبول قصہ کا سہارا لے کر

عوام کے دل میں بہت سے اخلاقی اور صوفیانہ نکتوں کو جاگزیں کرانے کی طرف ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے ان کا سب سے بڑا مقصد عشق الٰہی کی آگ کو لوگوں کے دل میں روشن کرنا اور اخلاق و مذہب کا پرچار کرنا تھا۔ چنانچہ جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ ایسا کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً جہاں پر قصہ ختم کیا ہے وہاں عشق حقیقی کا درجہ بتاتے ہوئے ایک عجیب صوفیانہ کیف پیدا کر دیا ہے: ؂

نہیں برہ کی آگ ہوتی جس کے جان میں — درندہ رہتے ہیں دونوں جہان میں
عجب یہ عشق کا سودا ہے یارو — دیئے سے نقد جاں ملتا ہے یارو
جنھوں نے عشق کے بازی کو کھیلا — لیا دونوں جہاں کا اس نے پالا

مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے: ؂

ارے دل غور کر کیا کیا مزا ہے — جدھر ہوں دیکھتا سرِّ خدا ہے
جو دیکھا ہر طرف ساری خدا ہے — نہیں ذرہ کوئی اس سے جدا ہے
وہی ہر ایک کا مقصود جاں ہے — نہاں آنکھوں سے گو ہے پر عیاں ہے
اسی کے نور سے شمس و قمر ہے — اسی کا نور ہر جا جلوہ گر ہے
وہی دریائے دل میں موج زن ہے — اسی کے رشحہ سے رنگیں چمن ہے
دلا کیا جلوہ نور خدا ہے — کہ جس کا شمہ یہ ارض و سما ہے
کیا ہے اس نے حسن و عشق پیدا — دو عالم کو کیا ہے مست و شیدا

پھر نعت رسولؐ میں چند اشعار کہے گئے ہیں: ؂

یہ کلمہ مشتہر ہے ہر طبق میں
کہا لولاک حق نے اس کے حق میں

نہیں جبریل کو جس جا رسائی
کیا اس میں جا فرمان روائی

کہاں جبریل کو اس جا ہے یارا
رسائی ہو جہاں وہ جلوہ آرا

مکانِ لامکاں اس کا مکاں ہے
خدائی ذات احمد سے عیاں ہے

جہاں ہے جلوۂ ذات محمدؐ
دو عالم پر تو یک نور احمد

واحمد رحمۃ للعالمین ہے
جھکی جس در پہ عالم کی جبیں ہے

درود حق سدا برجان او باد
دگر برآں و بریاران او باد

اس کے بعد قصہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:ـ

اسی بردہ زمیں پر یک جواں تھا
کہ رانجھی نام عالم میں عیاں تھا

وہ تھا باشندۂ تخت ہزارا
بھرا تھا حسن سے تن اس کا سارا

اس کے بعد رانجھی کے حسن کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:ـ

ولے سج اس طرح اپنی بنائے
بہارِ حسن جیون گلشن میں آئے

رکھا چیرا زری کا سر کے اوپر
خیالات اس پری کا دل میں لیکر

کمر باریک پر کا چھا بڑھا کر
گلے دھانی دوپٹا ٹک لگا کر

سنہری بانسری ایک ہاتھ میں لے
جہاں بیتاب ہو جس کے ندا سے

رانجھی کا حسن دیکھ چکے اب ہیر کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو:ـ

چلی جس دم وہ دریا کے کنارے
کرشمہ ناز سے قد کو سنوارے

ہزاروں ساتھ لے اپنے سہیلی
کوئی بیلی تھی اور کوئی چنبیلی

وہ پہنچی اس طرح دریا کنارہ
کہ جیون چاروں طرف مہ کے ستارہ

جو پہنچی پاس کشتی کے وہ مہرو تو کیا ہی دیکھتی ہے اک جواں کو

ایک جگہ رانجھی اپنی معشوقہ کی تعریف کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں پاتا ذرا اس وقت کی بے بسی ملاحظہ ہو :-

نشہ میں عشق کے یہ سوچتا ہے یہ ملک دلبری میں بادشا ہے
نہیں لیلیٰ اسے کہنا روا ہے کہوں کیا اس کو اسرار خدا ہے
عجب ہے شکل اس گل کی انوکھی یہ شیرینی سے زیادہ ہے گی میٹھی
جو دیکھے گا ایسے برباد ہوگا مثال کوہ کن فرہاد ہوگا
زلیخا بھی نہیں پاوے گی اس کو نگاہوں میں کبھی بھاوے گی اس کو
زلیخا اس کے جلوے میں نہاں ہے مگر یہ یوسف نامی یہاں ہے

مثنوی میر حسن میں اس وقت جبکہ شہزادہ بے نظیر کل کے گھوڑے پر سیر کرتا ہوا ایکا یک بدر منیر کے باغ میں اتر آتا ہے اور وہاں شہزادی بدر منیر کو دیکھ کر غش کھا جاتا ہے۔ بدر منیر کی سہیلیوں کی بوکھلاہٹ جس قدر دلچسپ ہے اس سے کم دلکش نہیں رانجھی کو پلنگ پر سویا دیکھ کر ہیر کی سہیلیوں کی "چہ میگوئیاں" ہیں لطف اندوز ہو جیے :-

کہا کس ہی نے سن اے مہر انور یہ ہے سالار جنوں کا مقرر
ترا بے ہوش کیوں ماجھی پڑا ہے شہ جن کا مگر یہ دل رُبا ہے
ترے ماجھی پہ سایا ہے اسی کا ترا ماجھی ستایا ہے اسی کا
اسی کے واسطے بے ہوش ہے وہ اسی کے سایہ میں مدہوش ہے وہ
کسی نے آ کہا جھوٹی ہے بہنا کرو موقوف جن کا نام لینا

مگر اس کا کنہیا نام ہیگا | بڑا تو کیا ایسے یاں کام ہیگا
سرہانے بانسلی کے ہے نشانی | مقرر یہ کنہیا ہے دوانی
جبھی وہ دیکھتا ہے خوبصورت | ذرا اپنی دکھا محبوب صورت
کسی نے آ کیا اندھی ہوئی ہے | یہ ہے عاشق کسی کا آدمی ہے
کسی کے دیکھنے کا ہے پیاسا | بھٹکتا پھرتا ہے ہو کر اداسا
مقرر تشنۂ دیدار ہے یہ | نشہ میں عشق کے سرشار ہے یہ
یہ متوالا برہ کا ہو رہا ہے | کسی کے واسطے یاں سو رہا ہے
غرض ہیر عشق کی ماتی کھڑی تھی | یہ باتیں ہر کسی کی سن رہی تھی

بارات آنے کے بعد ہیر کو بخار آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا دولہا شب زفاف میں ہیر سے قربت کرنے سے باز رہ جاتا ہے۔ اس کو ہیر تائید الٰہی سمجھتی ہے اور اس جذبہ کا اظہار اس طرح کرتی ہے:-

سوا رانجھی نہ شوہر جانتی ہوں | نہ ہیں دولہا کوئی بھی مانتی ہوں
اگر دولھا ہمارا ہے وہی ہے | مجھے رانجھی ملا تو حق سنی ہے
میں ہوں حرمت اسی کی تو بچالے | مری فریاد تک جلدی خدا لے
مجھے اس دم جو تو نے تپ دیا ہے | مری حرمت گئی کو رکھ لیا ہے
تو ہی ہے کارساز ما غریباں | تو ہی ہے رہنمائے ما اسیراں
پدر نے گرچہ سونپا اس جواں کو | تو ہی ہے جانتا سر نہاں کو
کہ جیسے اس گھڑی حرمت بچایا | ملا رانجھی سے جلدی یا خدایا

دلگیر اور دل شکستہ ہو کر رانجھا فقیری لے لیتا ہے اور دشت و بیابان کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ یکایک ایک درویش کامل سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے اور اس سے وہ فقیری بخشنے کی استدعا کرتا ہے۔ ان دونوں کی گفت گو بہت دلچسپ ہے اور اس سے "عشق حقیقی" اور "عشق مجازی" کی حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے :

بھٹکتا جا رہا یک دشت اندر
وہاں بیٹھا ہوا تھا یک قلندر

کہا رانجھے نے اس مردانہ حق کو
فقیری دیجئے اس مستحق کو

تفقد کیجئے اے میرے رہبر
کہ جس سے فضل حق ہو میرے اوپر

کہا درویش نے اے میرے بابا
اگر پرہیز بد سے تو کرے گا

اگر حور و ملک سے زن خوشتر
نہ اس کو دیکھنا بابا نظر بھر

تب اس دم دونگا میں تجھ کو فقیری
فقیری میں بھری ساری امیری

کہا رانجھے نے اے مردانہ مولا
ترازو میں یہ دل کے میں نے تولا

کہ جس کے عشق کی ہے یہ کمائی
جنھوں نے راہ مجھ کو یہ دکھائی

نہیں میں چھوڑ سکتا اس پری کو
اگر ہیں آپ کہتے بہتری کو

قلندر نے سنا اس کے بیاں کو
وہ سمجھا دل میں اس راز نہاں کو

تبسم کر کہا رانجھے کو بہتر
پکڑنا ہاتھ ہوں تیرا منفرد

اگر صید نگاہ ہیر کا ہے
مقید زلف کے زنجیر کا ہے

مگر دل بیچ رکھنا یاد مولا
یہ ظاہر ہیر کا باطن اوسی کا

ہو غافل کیا کر یاد حق کا
نہیں ہو، جاوے گا ناری حمق سا

"ہر جگہ توہی توہے" یعنی کثرت میں وحدت کے مسئلہ کو تصوفانہ رنگ میں درویش کامل رانجھا کو کیسے پیارے انداز میں سمجھاتے ہیں ملاحظہ ہو:ــہ

وہی ہر ایک رنگ میں مچا ہے — جدھر دیکھوں ہوں "ہر ہر" ہو رہا ہے
بجز اس کے سوا نہیں دوسرا ہے — اسی کا پوجنا ہر دم روا ہے
یہ توں جو دیکھتا ہے شکل میٹھی — سبھی کو پوجنا دھوکے کی ٹٹی
اور اس صورت سے اور ہی کچھ مزا ہے — سب ہی گنبد میں ایک ہی کی صدا ہے

رانجھا، ہیر کے در پر بھکاری کی شکل میں جاتا ہے۔ لاعلمی میں ہیر اس کو معمولی بھکاری سمجھ کر نکلوا دیتی ہے۔ رانجھی ایک باغ میں دھونی جما کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک عورت کے ذریعہ اپنا پیغام ہیر تک بھیجتا ہے۔

ذرا اس کا زور بیان ملاحظہ ہو:ــہ

کہے گی ہیر سے میری کہانی — کہ ایک جوگی مٹی اس کی جوانی
وہ رانجھی نام ہے اپنا بتاتا — وہ جوگی ہو ترے ملنے کو آیا
تو بیٹھی گھر میں سکھ آرام پاوے — وہ عاشق در پہ تیرے دھکے کھاوے
خردمندوں نے کیا بہتر کہا ہے — بتوں کی ذات بیشک بیوفا ہے

چند پُر تاثیر اور پیاری تشبیہیں بھی ملاحظہ ہوں:ــہ

کہوں کیا اس گھڑی کے میں پھبن پر — رکھے دھانی دوپٹہ گورے تن پر
جو موجِ حُسن پر اس کے نظر کی — ہر جوں سبز پانی میں قمر کی

دوپٹہ اس کے منہ پر سے اٹھایا ... دچھائیں سبز منہ پر سے ہٹایا

وہ پہنچی اس طرح دریا کنارہ ... کہ جیون چارو طرف مہ کے ستارہ

کتاب کے آخر میں یہ شعر ہے :ے

تو یاد دے گا اسی دم اپنے پی کو ... کہ کر راہ نما فضل علی کو

اس شعر سے ایک تو زیر بحث مثنوی ہیر رانجھا کے مصنف کا پتہ چلتا ہے دوسرے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حضرت فضل علیؒ جو حضرت منعم پاک کے مرید اور خلیفہ تھے رشد و ہدایت اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی قائم کئے ہوئے تھے۔

جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے حضرت فضل علیؒ کا مقصد مثنوی ہیر رانجھا کی تصنیف سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایک مقبول قصہ کا سہارا لیکر عوام کو رشد و ہدایت اور پند و نصیحت کرنے کا موقع نکال سکیں۔ چنانچہ اول تو قصہ کو ختم ہی ان دلنشیں اور عارفانہ نصیحتوں سے کیا گیا ہے :ے

یہ دنیا چند ساعت کا مزا ہے ... گیا جو بھول کر اس کی سزا ہے

اری سودا کرو سودا کرو تم ... خدا کی یاد سے ٹانڈا بھرو تم

عجب سودا یہاں کا ہے نفع کا ... وہی کمبخت ہے جو کچھ نہ لے گا

کروڑوں پر نہیں وہاں ہاتھ آتا ... جو کوڑی پر یہاں سودا بکاتا

جو آئے ہیں تو کچھ بھی لیجئے آپ ... جہاز اپنی نہ خالی کیجئے آپ

یہاں بھولا تو ہو جاویگا ناری ... نکل جاوے گی سب شیخی تمہاری

یہاں کی مفلسی وہاں بہتری ہے
تہی دستی وہاں کی بس بُری ہے

کمائے کچھ جو آیا ہے یہاں کو
چلا جاوے گا آخر اس جہاں کو

بجے گا جبکہ رحلت کا نقارا
چلے گا کچھ نہیں اس وقت چارا

مسافر کو نہ سونا چاہیئے ہے
نہ بگڑی سر کی کھونا چاہیئے ہے

اگر سویا تو بے حرمت ہوا تو
ز تیغِ راہ زن ناحق موا تو

اگر جاگے گا تو ایسے سفر میں
پڑے گا کب بھلا راہِ خطر میں

بچے گا گر یہاں تو زندگی سے
جئے گا وہاں سدا فرخندگی سے

یہاں کی نیستی ہے دہاں کی ہستی
ہے ویرانی یہاں کی دہان کی بستی

نہ چھوڑے گی قضا ہشیار رہنا
کمر باندھے ہوئے تیار رہنا

اور پھر مثنوی ہیر رانجھا کو ختم کرنے کے بعد بھی جب رشد و ہدایت کی تبلیغ سے جی نہیں بھرا تو فوراً ہی اسی بحر میں "قصہ دیگر" کے عنوان سے ایک اور عارفانہ قصہ کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اور یہ دوسرا قصہ سینتالیس اشعار پر مشتمل ہے تو بہت مختصر لیکن حد درجہ نصیحت آمیز، عارفانہ اور دلپذیر ہے مثلاً :-

پدر ایک شخص کا اپنے پسر کو
دکھایا خواب یہ لیل البدر کو

کہ پیچھے ہے مرے ایک شیر لاگا
وڈر سے اوس کے میں پھرتا ہوں بھاگا

چلا جاتا ہوں بھاگا راہ اندر
چھپا پھر اس کے ڈر سے چاہ اندر

وہاں ایک جھاڑ پکڑے ہوں میں لٹکا
ولیکن ہے بہت اس جا پہ کھٹکا

نظر آئے دو چوہے پھر اوسی دم
اور ہیں لگے کاٹتے وے جھاڑ ہردم

ہے اوجلا ایک اور ایک کالا
وہ بیٹھے کاٹتے ہیں جھاڑ اوس جا

تلے پاؤں کے دیکھا طاق ہیگا
اور اس میں سانپ بھی ہے ایک بیٹھا

نہ نیچے پاؤں رکھنے کی جگہ ہے
اور اوپر شیر کی مجھ پر نگہ ہے

جو پکڑے جھاڑ کو لٹکا ہوں اسدم
اوسے بھی کاٹتے چوہے ہیں ہردم

ایسی دہشت میں لٹکا ہوں اوسی جا
جو اتنے میں شہد ٹپکی مجھ کو سوجھا

کہ اس کوئیں کے اینٹے میں لگا ہے
اور اوس دم اوس کو بھی میں نے چکھا ہے

چکھا وہ تھا مرے مرغوب خاطر
ہوا مصروف لذت میں سراسر

نہ دہشت مار کا دل پر رہا کچھ
نہ کٹنے جھاڑ کا دہشت کیا کچھ

گیا ہوں بھول دہشت شیر کا بھی
مزے میں اس شہد کے پھنس گیا جی

جو اتنے میں لپسر بیدار ہوکر
تو ہے کیا دیکھتا بیزار ہوکر

نہ وہ ہے شہد اور کچھ بھی نہیں ہے
میں سویا ہوں یہیں دو کچھ نہیں ہے

جو دیکھا خواب میں رہبر خدا کو
گیا وہ پوچھنے کو ایک گدا کو

گدا تھا نام کا وہ بادشاہ تھا
نہایت واقف سر خدا تھا

کہا جب اوس گدا سے خواب سارا
لگا تب عرض کرنے یوں خدارا

شنیدی از زبانم انچہ خوابم
بیا نشں را عطا کن با جوابم

کہا تب اوس گدا نے کرکے زاری
کہ اے بابا یہ ہے گی بات بھاری

جو دیکھا شیر تو نے در قضا ہے
وہی اے دوست ہر ایک کی قضا ہے

وو در پے کسی کے ہو رہا ہے
نہیں بندہ کسی سے وو جدا ہے

مقرر شیر کے پنجہ میں آنا ... کرے گر لاکھ صورت کا بہانا
جو دیکھا جھاڑ تھا وہ زندگی ہے ... رہا ہوں یوں لٹک کیا زندگی ہے
کہ نیچے سانپ کا خطرا پڑا ہے ... اور اوپر شیر سر پر بھی کھڑا ہے
وہی خوش بخت جو سویا یہ جاگا ... جو سویا ہے سراسر وہ ابھاگا
جو چوہے دیکھیں ہیں دن رات ہیگا ... کہ جس کا تن ہے اوجلا اور کالا
یوں ہی کٹ جاتا ہے دن رات سب کا ... جواں مردی رکھے جو یاد رب کا
جو کرتا دل ستی یاد خدا ہے ... اوسی کے واسطے ارض وسما ہے
وہ تونے سانپ جو دیکھا ہے بابا ... وہ عزرائیل ہے حق کا پیارا
کہ جسدم جھاڑ چوہا کاٹ لیگا ... اوسی دم وہ فرشتہ آ لے گا
پکڑ کر طوطی شیریں زباں کو ... وہ لیجا ویگا اس ملک نہان کو
کنواں او جانئے دنیا برادر ... شہد جو ہے مزا اس کا سراسر
تو بھولا اوس شہد کے چاٹنے ہیں ... وہ چوہے ہیں عمر کے کاٹنے میں
اے بابا خوف دل کے بیچ ہردم ... تو کر اپنی بدی پر ہر گھڑی غم
سدا دل بیچ رکھ یاد خدا کو ... رہائی تیری ہو روز جزا کو
پدر تیرے کا ہیگا تجھ پہ سایا ... تجھے اب خواب غفلت سے جتایا
سنی تعبیر جسدم یہ گدا سے ... فقیری کی لباس اپنی بنا کے
رنگا کر گیروا ین کر کے جوگی ... تنبورا ہاتھ میں لے ہو بروگی
پھرا شہروں میں تنبورا بجاتا ... یہاں سے تے یہاں تے بے سناتا
محبت پیو سے یہاں تک لگایا ... کہ آخر کو سہاگن وہ کہا، یا

جو دل کا رس مزے میں آئے جی کو — وہی پاوے گا اپنے پیارے پی کو
کرے گا جو کوئی یاد اس کی دل سے — کثافت سے نکل باویگا گل سے
غمیں ہجرت سے اس کے خون بہاکر — پپیہا کی طرح پی پی کہا کر

بہاری اردو کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے علمائے السنہ نے اس کی تین خصوصیات بتائی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کی زمین بہاری "اپ بھرنش" یعنی مگہی، بھوجپوری اور میتھلی ہیں۔ دوسری یہ کہ بہاری بولیوں میں پنجابی اثر قبول کرنے کا مادہ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ دہلی سے مسلسل سیاسی، ادبی اور ثقافتی تعلقات ہونے کی وجہ سے وہ لسانی تبدیلیاں جو دارالسلطنت میں ہو رہی تھیں دکن کی بہ نسبت بہار میں زیادہ جلد ظاہر ہوتی تھیں۔ اور دہلی کی زبانوں پر جو بھی تبدیلیاں ہوتی تھیں بہار ان کو فوراً قبول کر لیتا تھا۔ دہلی میں کھڑی بولی کا غلبہ ہوا تو بہار میں اس کا اثر فوراً نمایاں ہونے لگا۔ اب ہم اس نظریہ کے تحت زیر بحث مثنوی کا لسانی تجزیہ کریں۔

یہ مثنوی راسخ عظیم آبادی کے دور میں لکھی گئی ہے جس میں بہار کی ادبی اور تصنیفی زبان بہت کافی شستہ اور ستھری ہو گئی تھی۔ لیکن مثنوی ہیر رانجھا کی زبان اس مناسبت سے اتنی صاف نہیں بلکہ مگہی بولی کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مصنف کو اپنے وطن سے باہر کی زبان سے متاثر ہونے کا کم موقع ملا۔

برخلاف اس کے راسخ کو باہر بھی جانے کے مواقع حاصل ہوئے نتیجہ میں ان کی زبان بہت صاف ہو گئی اور اس پر کھڑی بولی کا اثر بہت نمایاں ہو گیا۔ مثنوی ہیر رانجھا میں فارسی ترکیبیں کثرت سے ملتی ہیں بلکہ بعض جگہ پورا کا پورا شعر فارسی ہی میں کہہ دیا گیا ہے اور جہاں فارسی ترکیبوں کا استعمال کیا گیا ہے وہ اتنا برمحل اور خوبصورت انداز سے کہ اس سے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے جیسے رانجھی کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اس پردہ زمین ایک جواں تھا | کہ رانجھی نام عالم میں عیاں تھا
بہ ملک خویش چوں خورشید او بود | جمالِ نازنیناں صید او بود

اس مثنوی میں ہندی الفاظ بہت زیادہ ملتے ہیں اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان صوفیائے کرام کو چونکہ مزاج ہندی کا بڑا پاس تھا اور فضل علی صاحب بھی صاحبِ سلسلہ صوفی بزرگ تھے اس لئے ان کے کلام میں ہندیت کا غلبہ کچھ زیادہ قابل تعجب نہیں۔ ان ہی کے ہم وطن لیکن ان سے کئی سال پہلے قاضی عبد الغفار غفاؔ گزرے ہیں جن کی زبان پر کبیرؔ کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔

آجکل کے لحاظ سے اس مثنوی کی زبان، املا اور الفاظ میں جو فرق پایا جاتا ہے نموناً ان میں سے چند کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جی	بجائے	جیو	ہوگا	بجائے	ہیگا
وہ	"	دو	جیسے	"	جیون

کسی ہی نے	بجائے	کسی نے	ان ہی سے	بجائے	یہاں سے
سینتی	"	سے	توں	"	تو
ایسے	"	ایسے	تنجکو	"	تجھکو
اوسے	"	اسے	کبھیں	"	کبھی
مقرر	"	یقینی	رہوں ہوں	"	رہتی ہوں
دیکھتا	"	معلوم ہوتا ہے	نرباہ	"	نباہ
جاگہ	"	جگہ	رہنوالے	"	رہنے والے
پوکارا	"	پکارا	سبھونہ	"	سبھوں نے
دہس	"	دیا	ہی	"	نہیں
بولا بھجونگا	"	بلا بھیجونگا	سوناتا	"	سناتا

(۷) حضرت شاہ آیت اللہ جوہری مذاقی

حضرت غلام سرور المعروف بہ شاہ آیت اللہ جوہری

اردو فارسی دونوں کے قادر الکلام شاعر، اور صاحب سلسلہ صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا شاہ محمد مخدوم بہت ذی علم اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت ذکیہ بھی بڑی عابدہ زاہدہ اور عربی فارسی اردو تینوں زبان پر پوری دستگاہ رکھنے والی خاتون تھیں۔ حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کی پرورش و پرداخت ایسے ماحول اور ایسی ہی گود میں ہوئی تھی۔ آپ کی پیدائش صاحب تذکرۃ الصالحین کے مطابق

، شوال ۱۱۲۶ھ کو ہوئی اور وفات ۱۲۱۰ھ میں۔ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی قصبہ بین میں گذری۔ سیر و سیاحت کے شوقین تھے اور بنارس وغیرہ کئی جگہوں کا سفر کیا۔ ۱۱۷۳ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کی مسندِ سجادگی پر متمکن ہوئے۔

حضرت شاہ آیت اللہ فارسی میں شورش اور اُردو مرثیہ گوئی میں مذاقی اور اردو مثنوی میں جوہری تخلص کرتے تھے۔ آپ کا فارسی دیوان کلکتہ امپیریل لائبریری میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اس کے دو اشعار دیئے ہیں :-

گردش چشم بتاں گردش جام ست اینجا
غیر ازیں بادہ دگر بادہ حرام ست اینجا

گر بند ملائک ہمہ بر حالت شورش
گریم شبے آہ بہ گردوں رود از دل

حضرت شاہ آیت اللہ کے متعلق میر غلام حسین شورش عظیم آبادی نے اپنی مشہور تصنیف تذکرۂ شورش میں اس طرح لکھا ہے :-

"مولوی آیت اللہ جوہری تخلص متوطن پھلواری شاعر فارسی است صاحب علم و فضل، درویش کمل، مزاج عالیش سوئے ریختہ میل تمام دارد ازوست :-

لگایا عشق نے آ مجھ دل بیتاب میں آتش
کہ دے ہے جوں ہوس بوتہ سیماب میں آتش"

تذکرۂ عشقی میں بھی شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی نے حضرت شاہ آیت اللہ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے لکھا ہے :-

"جوہری تخلص اسمش مولوی آئت اللہ، مردے فاضل از بزرگانِ قصبہ پھلواری ست بیشتر فکر مرثیہ وسلام ہندی می کرد و در مقطع مرثیہ مذاقی و در غزل فارسی شورش تخلص می آورد۔ گاہ گاہ بہ نظم پردازی ریختہ نیز جوہر طبع خود بہ عنوان فاضلان آشکارامی ساخت"

حضرت شاہ آئت اللہ جوہری کی شادی حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی کی صاجزادی سے ہوئی تھی جن سے حضرت شاہ شبلی آپ کے فرزند ہوئے اور آپ کے بعد مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔

اردو میں غزل کے نمونے آپ کے بہت کم دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن مثنوی، مرثیہ، منقبت، شہر آشوب اور قصیدہ ان کا منظر عام پر آچکا ہے۔ سب سے پہلے حضرت شاہ آئت اللہ کے تفصیلی حالات اور کچھ کلام کے نمونے حکیم محمد شعیب صاحب پھلواروی نے اپنی تصنیف تجلیات الانوار میں پیش کئے۔ ان سے پہلے شورش اور عشقی نے اپنے تذکروں میں مختصر سا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن شاہ آئت اللہ جوہری کی نادر مثنوی گوہر جوہری کا ۱۹۴۰ء میں پروفیسر حسن عسکری صاحب نے انکشاف کرکے ان کے متعلق مزید تجسس کو بڑھا دیا۔ مثنوی گوہر جوہری کا یہ نسخہ پروفیسر موصوف کو اپنے ایک ہندو شاگرد رائے سیوندر بہادر ایم اے رئیس قصبہ بھگرا ضلع مظفر پور (بہار) کے ذاتی کتب خانے سے ملا تھا۔ جس پر ایک تفصیلی مضمون لکھ کر انہوں نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع کرا دیا تھا۔

اس کے بعد اسی مثنوی گوہر جوہری کا ایک نا مکمل قلمی نسخہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے شاہ مجتبیٰ صاحب بہار شریف کے ذاتی کتب خانے میں دیکھا۔ ان دونوں نسخوں کے علاوہ مثنوی گوہر جوہری کا اور کوئی تیسرا نسخہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔ پھلواری شریف میں بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ لیکن حضرت شاہ آیت اللہ کے مراثی اور شہر آشوب پھلواری شریف میں موجود ہیں جن سے محققین آسانی سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

مثنوی گوہر جوہری بارھویں صدی ہجری کے وسط کی مروجہ زبان کا صحیح اور مکمل نمونہ ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار تین سو ایک ہے۔ پوری مثنوی میں دو بحریں ترتیب وار استعمال کی گئی ہیں۔ بحر متقارب مثمن محذوف الآخر (فعولن فعولن فعولن فعل) اور بحر ہزج مسدس مقصود العروض والضرب یا محذوف الآخر (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن یا فعولن۔

حضرت جوہری نے مثنوی میں اپنی زبان کو ہندوی اور ریختہ کہا ہے:-

زبان ہندوی میں مثنوی کہہ | ہمن کی بات سن خاموش مت رہ
رکھا نام میں گوہر جوہری | کہا ریختہ بیچ یہ مثنوی

مثنوی گوہر سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کی تصنیف ہے۔ جوہری کے ان اشعار سے سنہ تصنیف کی تصدیق ہوتی ہے۔

کہا ریختہ بیچ یہ مثنوی | رکھا نام میں گوہر جوہری
کرے جس کی تاریخ کا گر خیال | رتن جوت منکا سنیں تو جو نکال
۱۱۶۱ھ

پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں جو نسخہ ہے (یعنی پروفیسر حسن عسکری والا) یا شاہ مجتبیٰ صاحب بہار شریف کے ذاتی کتب خانہ میں جو اس کا نسخہ ہے۔

دونوں ہی نامکمل ہیں۔ اور آخر کے صفحات غائب ہیں اس لئے سنہ کتابت کا پتہ نہیں چل سکا۔
مثنوی گوہر جوہری کئی داستانوں پر مشتمل ہے اور ان داستانوں کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ آخری داستان میں اکبر آباد کے رام راجہ اور کنول دیبی کے عشق کو روائتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ہیرو وہیروئن دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں بہت مشکلوں سے دونوں کی مراد بر آتی ہے اور شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد پھر رام راجہ بچھڑ جاتا ہے اساڑھ سے جیٹھ تک کنول دیبی ہجر کی آگ میں جلتی رہتی ہے اور اسی دوران اس نے بارہ ماسہ کہا ہے۔ جس میں اس نے اپنے محبوب تک اپنا پیام پہنچانے کے لئے مختلف پرندوں کو اپنا پیامبر بنایا ہے۔ یہ پرندے ہنگم، کوکلا، کنجن، سبزک، سرخاب، سارس، کبوتر، بسنتا، بلبل، کاگ اور طوطا ہیں ان میں طوطا آخری اور کامیاب قاصد ثابت ہوتا ہے۔ رام راجہ پھر آجاتا ہے لیکن یہ وصل کی گھڑیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ کنول دیبی بیمار پڑتی ہے اور مر جاتی ہے۔ کنول دیبی کو جب جلایا جانے لگا تو اس کی چتا سے عشق کی آگ بھڑکتی ہے اور رام راجہ ! رام راجہ کی آواز نکلنے لگتی ہے۔ رام راجہ اس شعلۂ محبت کی طرف بیتابانہ جاتا ہے اور خود بھی اس آگ میں جل کر فنا ہو جاتا ہے۔ داستان سے زیادہ اس مثنوی میں بارہ ماسہ نے بڑی جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ افضل جھنجھانوی کا لکھا بارہ ماسہ اس سے قبل کی تصنیف ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب اور پروفیسر

حسن عسکری کا خیال ہے کہ حضرت جوہری کا لکھا بارہ ماسہ میں افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسہ سے بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

افضل جھنجھانوی	حضرت جوہری
ہندولی جھولتی سبھ نار پیہ سنگ حسد کی آگ نے جارا مرا رنگ	سکھی سب جھولتے پیو سنگ جھولا جھولانا چرخ مجھ کون چرخ ہنڈولا
اندھیری رین جگنوں جگ مگاتا اری جلتی اوپر تین کیا جلانا	ارے جگنوں کا ایسا جگمگانا ہوا نئیں اس سمے میں پیو کا آنا
گھٹا کاری اور چھاتی سوں آہی برہون کی فوج تے کینی چڑاہی	گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم مرے جی بیچ برہا آ کرے دھوم

لیکن مجھے اس خیال سے تھوڑا اختلاف ہے۔ بارہ ماسہ جب بھی لکھا جائے گا اس میں اسی طرح کے جذبات آئیں گے اور اس طرح جتنے بارہ ماسہ ایک جگہ جمع کئے جائیں گے ان میں مشابہت پائی جائیں گی۔ افضلؔ جھنجھانوی کا بارہ ماسہ حضرت جوہری کی نظر سے گذر چکا ہو اس سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ساون کے مہینے میں جب کالی گھٹا جھوم جھوم کر اٹھتی ہو۔ اور دوسری سہیلیاں لہک لہک کر جھولا جھول رہی ہوں

اس وقت ایک ہجر کی ماری عورت اپنے پی کی عدم موجودگی کو محسوس کر کے جب بھی اپنے جذبات کا اظہار کرے گی اس میں یکسانیت اور مشابہت کا ہونا ضروری ہے۔

اب حضرت جوہری کے بارہ ماسہ میں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اساڑہ آیا لگا بادل گرجنے ۔۔۔ اندھیری رات میں بجلی چمکنیں
گگن پر برق نئیں ہیگا چمکتا ۔۔۔ مرا شوقوں ستین ہے دل پھڑکتا

گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم ۔۔۔ مرے جی بیچ برہا آ کرے دھوم
زمین کون ہے قبائے سبز در بر ۔۔۔ سمیں ایسے میں پیو میرے ہیں باہر

پیا بن ہے ہماری سیج سونی ۔۔۔ ہوئے رہ رہ مجھے دکھ درد دونی
پیا کے وصل کی ہوں ایسی بھوکی ۔۔۔ کہ جوں سورج کے پھول سورج ہو کھی
کنول ہوں میں کنول ذی ہے مرا نام ۔۔۔ مجھے جل بیچ بن سورج نہ آرام
نہ سورج بن ہوں میں آرام کل میں ۔۔۔ کھڑی جلتی ہوں نت آنسو کے جل میں
اکارت جائے ہے میری جوانی ۔۔۔ پیا پردیس کیا یہ زندگانی
ارے کاتک کے ایسی دودھ کی رات ۔۔۔ میں کہواروکے کنچن سن مری بات
میں بے پر ہوں گی بے بس تو ہے پرزار ۔۔۔ مرا قاصد تو ہیں تجھ پر مرا بھار
دکھاؤں تجھکوں دل کی آگ کیونکر ۔۔۔ کروں میں آہ تو تیرا جلے پر

گیا پھاگن چڑھا اب چیت سر پر
جلی ہولی ہماری آگ لے کر
رہا ہے پھول سنبل آج بن میں
لگی ٹیسو کے دیکھے آگ تن میں

تجھے تو گرمی بازار ہے گل
مری آنکھوں میں آتش زار ہے گل
جلے گا گل لگے گی باغ میں آگ
ارے بلبل شتابی بھاگ تو بھاگ

ستارے ہو گئے جل کر کے اخگر
نکلتا ہے سحر خورشید جل کر
بگولا جیٹھ کا آتش فشاں ہے
غبار خاطر سرگشتگاں ہے

طوطا کنول دی کا آخری پیامبر بڑا مبارک ثابت ہوا۔ اس سے رام راجہ کے آنے کی خبر ملتی ہے:-

مشاطہ مجھکوں آرائش ہے درکار
ہمارا آج کلمہ گھر آ چلا یار
شتابی کر مری زلفوں کو شانا
کہ آتا ہے چلا مراد یوانا
جب آویگا میں دیونگی اسکو زنجیر
نکر تو شانہ کرنے میں ذرا دیر

راجہ رام کے آجانے کے بعد وصل کی گھڑی تھوڑی ہی دنوں کے لئے پُر مسرت رہتی ہے۔ کنول دی بیمار پڑ جاتی اور اس کی بیماری کا حال اس مثنوی میں ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

گئی وہ اس قدر نازک بدن ہو
کہ یک گلبرگ کا سو پیرہن ہو

نہ چھن سکتی زرہ خ زلفوں کا دامن | گلے میں ہو گئے چوں طوق آہن
اپنی نازک ہوئی اور ناتواں حال | نظر آتی نہ آئینے میں تمثال
نہ آتا لب تلک بھی شعلۂ آہ | نفس گیتی تھی چوں شمع سحرگاہ

اپنی محبوبہ کنول دی کی علالت کے باعث رام راجہ کا الگ برا حال تھا۔ وہ غم و الم سے گھلا جا رہا تھا۔ حضرت جوہری نے رام راجہ کی زبوں حالی کی مرقع کشی اس طرح فرمائی ہے:۔

پریشان خاطر و آشفتہ اطوار | گیا ہو مضطرب چوں نبض بیمار
سراسیمہ ہوا اور اشک ریزاں | گیا بستر تلک افتاں و خیزاں
دم آخر و شوریدہ تصویر | ہوا معشوق سے جا کر بغل گیر
لگی کہنے کہ اے دیوانہ میرا | میں تیری شمع تو پروانہ میرا
کوئی ساعت میں آوے گی قیامت | میں جاتی ہوں سدا تو رہ سلامت
ترے نہیں دیکھ کر آتی رُوائی | کہ دیگی اب اجل داغ جدائی
ہوا اس فکر میں میرا جگر آب | کہ دوری کی مجھے کیونکر رہو تاب

چو نوبت وصل کی اس مد کے آئی | دیا دل کا نگینا ں منہ دکھائی

خانقاہ سلیمانیہ (چھوٹی خانقاہ) پھلواری شریف میں وہاں کے صوفیا اور مشائخ کے کہے ہوئے مراثی کا مجموعہ ایک قلمی نسخہ کی شکل میں موجود ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت شاہ آیت اللہ نزاقی کے کہے ہوئے کئی

مرثیے بھی ہیں۔ اس مخطوطہ سے چند مراثی درج ذیل ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی اپنی تصنیف "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" کو مکمل کرنے کے دوران اس مخطوطہ سے استفادہ کیا ہے۔ پہلا مرثیہ ۲۴ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند کا اختتام "ہائے حسین بدیسی پنتھی" پر ہوتا ہے: ؎

(۱)

آلِ نبی نہیں جیسے پایا ہائے حسین بدیسی پنتھی
کٹا بتول و علی کا جایا ہائے حسین بدیسی پنتھی
تیغ ستم کو تن پر کھایا ہائے حسین بدیسی پنتھی
خنجر سے گردن کٹوایا ہائے حسین بدیسی پنتھی

(۲)

تن کو سر سے ہے نہ پہرا اُدھر اُس تن سے دور ہے دور
سر نیزہ پر جھوم رہا ہے تن ماٹی میں گھاڈے چور
ہائے نبی کا خاصہ نواسا واے بتول علی کا پور
کیا کیا ظلم نہ اس پر آیا ہائے حسین بدیسی پنتھی

(۳)

بعد شہید ہونے سرور کے خیمہ بیچ در آیا قاتل
لو ہو بھرا وہ خنجر براں کف میں چمکایا قاتل
گھر میں اساسا جو کچھ پایا پیادوں سے لٹوایا قاتل

سب لنوات سے نالہ بر آیا ہائے حسین بدلیسی پنچھی

(۴)

قتل کیتیں عابد کے ہے ہے جب قاتل نے ارادہ کیا
اوس بیمار کے سر کٹنے کو جب کہ تعین پیادہ کیا
خواہی نخواہی غصہ ہو کر قتل پہ زور زیادہ کیا
پھوپھی نے اس کو روک بچایا ہائے حسین بدلیسی پنچھی

(۵)

اہل حرم کے مقتل اوپر جس دم ہائے سواری آئی
لاشس کے پاس آئی سب بی بی رونے غم کی ماری آئی
خاص کہ وہ بہنیں سرور کی کرتی نالہ وزاری آئی
بی بانو کو غم نے رولایا ہائے حسین بدلیسی پنچھی

(۶)

بہن حسین کی روئے زینب بی بی زہرا جی کی جائی
آنکھ سے بوندیں ٹپک گرت ہے بانو ساون کہیں برسائی
لاشس کے نال کھڑی وہ روئے ہائے رے بھائی ہائے رے بھائی
ٹُبا بہن کے سر کا سایا ہائے حسین بدلیسی پنچھی

(۷)

اور کلثوم حسین کی خواہر روئے کاندھے پیٹے پچھڑے
کوئی نہ بیکس کا حامی ہے کون کرے مظلوم کی بچھڑے

کوئی شامی کٹھن کٹھور ہے کہاں ایہوں کو دیا اور چھوڑے
کب نرموہے کو موہ اور مایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۸)

روئے بانو شاہ کی بی بی ہائے رے سئیاں ہائے رے سئیاں
تو جیتا اور میں مرجاتی رہتی جگ میں تیری نئیاں
ہوں قربان اور صدقے واری چھڈی مدی تو برگیاں
ایہہ بن میں سیس کٹایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۹)

ون ہے ڈرونا بن ہے ہونا کوئی نہیں ہے ہیت اور سنگی
درجن کی سینا ہے بہاری چاروں وس سب فوج ہے جنگی
بچے پیاسے بھوک مرت ہیں پانی کا نکڑا دانے کی تنگی
یہاں میں اپنا مول گنوایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۱۰)

کون سنے ہے تنہا ہمارو کاسے کہوں دکھ کی کہانی
اے میرو کنت اور اے میرو بالم توری صورت خاک سمانی
اے میرو جانی اے میرو جانی اے میرو جانی اے میرو جانی
درجن موسے تو وہ چھوڑا یا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۱۱)

ہوں میں اپنے نصیب کی کھوٹی پھوٹی کیا کہوں ہیں قسمت کی خوبی

جی جینے سے ناک پر آیا گل میں سانس رکی میں او بی
جہہ مورت سے چاند لجاتا سو صورت لوہو میں ڈوبی
کاٹ گلا لوہو سے نہلایا ہائے حسین بیدیسی بنتھی

(۱۲)

مجھکو کس پر چھوڑ گئے ہو تم ہوئے جا فردوس کے باسی
حور نے تم کو پلایا پیالہ میں رہی دیسی ہی بھوکی پیاسی
تم بن کون کھبریا لیوے تو میرا والی میں تیری داسی
خلدِ بریں میں جا گھر چھایا ہائے حسین بیدیسی بنتھی

(۱۳)

رہا نہ والی کوئی سر پر ہم بیکس کا حال بتر ہے
دیکھیں آگے کیا پیش آوے دشمن کا اب خوف و خطر ہے
لاش پڑی ہے خاک کے اوپر کفن جدا لوہو سے تر ہے
غسل شہید نے خون سے پایا ہائے حسین بیدیسی بنتھی

(۱۴)

کا سے کہئے کون سنے ہے کوئی غمخوار نظر نہیں آوے
اے مرے سئیاں تیرا جنازہ کون مدینہ لے پہنچاوے
گورکھند اکر لحد بنا کر جد کے روضہ پاس گڑاوے
یہاں ہے دشمن کا ہمسایا ہائے حسین بیدیسی بنتھی

(۱۵)

ٹپک ٹپک کر گرتے آنسو لاش کے جاتی واری پھیری
تو میرا مولا تو میرا خاوند میں تیری باندی میں تیری چیری
کیا کروں بس بوسا ئی نہ اپنا ہوں بے بس ہیں دکھ کی گھیری
عدو نے مجھ کو آ گھیرا یا ہائے حسین بیدیسی بنیتھی

(۱۶)

دیکھ آ اپنا نور دو دیدہ جسکو کچھ نہیں تاب و تواں ہے
گل میں اوس کے طوق پڑی ہے دونوں پاؤں میں بند گراں ہے
فقط خدا ہی اس کو بچاوے بچنے کی امید کہاں ہے
بچی کو تیری کلپایا ہائے حسین بیدیسی بنیتھی

(۱۷)

قتل کو اس کے کوئی دہراوے غضب سے دیکھے آنکھ نکالے
تیغ علم کئے ہے کوئی کوئی کف میں تو لے بھالے
ہائے یہ پیارا بیٹا تیرا پڑا ہے کس ظالم کے پالے
کس شدت میں ہے تیرا جایا ہائے حسین بیدیسی بنیتھی

(۱۸)

لاشِ شہید کے گرد بہ گرد آ سب بی بی دکھیاری روئی
اماں اور پھوپھیاں کو روتے دیکھ سکینہ باری روئی
ہائے یتیم وہ بھوکی لڑکی شاہ کی بیٹی پیاری روئی
چپ نہ ہوئی وہ گو بہلایا ہائے حسین بیدیسی بنیتھی

(۱۹)

کہتی اماں مت رو بیٹی تجھ یتیمی کا دن آیا
اس بچپن میں تیرے سر سے مٹ گیا باباجی کا سایا
بالی لڑکی دولاری کو اب کیوں کر پالوں بار خدایا
جس کے باپ نے سر کٹوایا ہائے حسین بیدیسی مینھتی

(۲۰)

رونے سے وہ چپ نہیں ہوتی جس رونے سے تڑکے سینا
جب جب سب کو روتے دیکھے روئے پکار پکار سکینا
اور غذا کچھ بھی نہیں حاضر خون جگر تھا کھانا پینا
تیرا غم کس طرح سے کھایا ہائے حسین بیدیسی مینھتی

(۲۱)

جاگ پڑی وہ خواب سے جس دم بابا بابا کہکر روئی
نالہ کری با دیدۂ پرنم بابا بابا کہکر روئی
تازہ ہوا زنداں میں پھر غم بابا بابا کہکر روئی
ہو گیا نالہ بلند و بکا کا ہائے حسین بیدیسی مینھتی

(۲۲)

رونے سے خاموش نہوتی شام تلک وہ روتی جاوے
ڈھونڈھے ہے باباجی کو نہ پاوے آپ روئے اماں کو رلاوے
دیکھی باباجی کی صورت ایک شب اوس کو خواب جو آوے

خواب میں اوس کو آ بہلایا ہائے حسین بیدیسی پنچھی

(۲۳)

تھا وہ نالہ ایسا بھاری جس کے سنتے پھٹے کلیجا
پر بیدرد کی سنگ تھی چھاتی کچھ نہیں سینا اوسکا سیجا
اوس دختر کے کھانے کے لئے سر کو طبق میں دھر کے بھیجا
تیرا سر کھانے کو آیا ہائے حسین بیدیسی پنچھی

(۲۴)

قصہ غم کا دور دراز ہے کہہ مت آگے اس کے مذاقی
قلم کا دل رفت میں آیا بہت رہا لکھنے کو باقی
روز جزا میں پانی پلانا اے کوثر کے حوض کے ساقی
نالہ و آہ سے دل بھر آیا ہائے حسین بیدیسی پنچھی

اس مرثیہ کے اختتام پر پھلواری شریف کے قلمی نسخہ میں یہ عبارت درج ہے :-

"تمت المرثیہ من تصانیف مولی الموالی استاد کل اداتی و اعالی حضرت مذاقی الملقب بہ شاہ محمد آیت اللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز۔ کتبا مخدوم عالم عفی عنہ ذنوبہ' و ایں مرثیہ در ۱۲۰۶ھ یک ہزار و دو صد و شش ہجری در تعزیہ خانہ سید فیض علی صاحب علیہ الرحمۃ خواندہ شد"

اس عبارت سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ مرثیہ شاہ آئت اللہ مذاقی کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے اس کے کاتب مخدوم عالم ہیں جنہوں نے سنہ ۱۲۰۶ھ میں سید فیض علی صاحبؒ کے تعزیہ خانہ میں مرثیہ خوانی کے دوران سن کر قلمبند کرلیا ہے۔ تیسرے اس مرثیہ کی کتابت کے وقت مصنف یعنی حضرت مذاقی بقید حیات تھے۔ کیونکہ ان کا وصال سنہ ۱۲۱۰ھ میں ہوا ہے۔

اب حضرت مذاقیؒ کا لکھا ہوا دوسرا مرثیہ اسی قلمی مخطوطہ کے حوالے سے درج ذیل ہے۔ یہ مسدس کی شکل میں ہے۔ چوتھے پانچویں مصرعے رلواں بولی میں ہیں اور ان میں بھاشاؤں کا رنگ گہرا ہے اور ٹیپ کی بند پر اودھی بولی کی چھاپ زیادہ ملتی ہے۔ اور اس کے چار بند ہیں۔ لیکن یہ مرثیہ نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کاتب نے چار صفحات آخر میں سادہ چھوڑے ہیں۔ قرینہ ہے کہ کاتب نے اس مرثیہ کو بھی کہیں مجلس میں پڑھنے کے دوران ہی قلمبند کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ جو بند چھوٹ گئے ہوں گے ان کو بعد میں پوچھ کر پورا کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہوگا لیکن کر نہ سکے ہوں۔

(۱)

جس کا پدر گما ہو نہ روئے تو کیا کرے
تن خاک میں پڑا ہو نہ روئے تو کیا کرے

مقتل میں خوں بہا ہو نہ روئے تو کیا کرے

جس کا بابا مر گیا چھوری کو کہائے حسین
تس کا بیٹا عابدیں رووت ہے دن رین

(۲)

امان تیم خستہ کی بانو شکستہ دل
رنے سے شاہِ دیں کے گئی خاک بیچ مل
کیونکر نہ روئے چھاتی پہ غم کی دھری ہو سل
جس پر کے دکھ پڑا ہو نہ روئے تو کیا کرے

نیناں موں انجھواں بھرے بکھرے سیس کے بال
رووت پی پیارے اوپر مکھ پر انچرا ڈال

(۳)

روتی تھی شہر بانوے ناچار ہائے ہائے
کرتی تھی آہ و نالہ جرس وار ہائے ہائے
کہتی تھی رو بہ دیدۂ خونبار ہائے ہائے
دیدہ میں خون بھرا ہو نہ روئے تو کیا کرے

جیسے بن کا پپیہا رٹت رہے پی پی
ویسے میں پی پی رٹوں جو لہہ گھٹ بیچ جی

(۴)

تھی حضرت امام کی دو محترم حرم
بانو ستم رسیدہ کو کیا کیا نہ تھا الم
اوڑتا تھا مرغ نالہ کا سینہ سے دم بدم
جس کا کہ شوکٹا ہو نہ روئے تو کیا کرے

آگ لگے جہہ سیس سوں کیسے کل ہو واہ
جیسے تڑپھت لاش ہے ویسے تڑپھت ماہ

حضرت مذاقی کا تیسرا مرثیہ چوپائی کی شکل میں ہے۔ اس کے آٹھ بند درج ذیل ہیں۔ یہ مرثیہ حکیم شعیب صاحب پھلواروی مرحوم کے قبضہ میں تھا۔ اور رسالہ معاصر پٹنہ بابت دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

(۱)

لوٹ لیو بنجارہ بن میں ۔۔۔ ٹانڈا لدا ہوا سارا بن میں
ہائے حسین بچارہ بن میں ۔۔۔ بیکس کرکے مارا بن میں

(۲)

بن میں کھڑی بنجاری روے ۔۔۔ گھر جو لٹا گھر باری روے
بانو دکھیا بچاری روے ۔۔۔ مرا دل جس کا مارا بن میں

(۳)

بٹ ماروں نے بن میں گھیرا ۔۔۔ لوٹ لیا سب خیمہ ڈیرا
ہائے حسینا را دل میرا ۔۔۔ سیس بدن سے اتارا بن میں

(۴)

جو جھا سارا کنبا رن میں
لوتھ پڑی ہے کالے بن میں

جیسے برسے مینہ ساون میں
اڑت ہو کا پھہارا بن میں

(۵)

بانو دکھیا کو کے دکھ سے
اکبر کا ہے سوئے ہو سکھ سے

میٹھے بچن کچھ بولو مکھ سے
جاگو سانجھ سکارا بن میں

(۶)

اکبر ہمرا راج دلارا
اکبر ہمرے نینوں کا تارا

ہائے رے ہمرا اکبر پیارا
تو ہے کس نے مارا بن میں

(۷)

زینب دکھیا سوگ کی ماری
لوتھ پہ بھائی کی کرے ہے زاری

بھائی تم پر زینب واری
اب رہا کون سہارا بن میں

(۸)

سوگ بچن کا کو ہے سنویّا
رکت سے بھر گئی تال تلیّا

یہ لوتھ پڑی ہے بھیّا
بہا سوندی دھارا تن من

حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کی لکھی ایک شہر آشوب کا قلمی نسخہ بھی حکیم شعیب صاحب پھلواروی کے قبضہ میں ہے۔ اس شہر آشوب سے میر اور سودا کی شہر آشوبوں کی طرح صوبہ بہار اور خاص کر عظیم آباد

کی معاشرتی، سماجی، مذہبی اور سیاسی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کہاں ہے دین کی شوکت، گئی کیدھر مسلمانی
کیا ہے کفر نے اس دور ہون ازبسکہ طغیانی
خراب ہیں مسجد محراب بنتے ہیں صنم خانہ
نہوئے....... ؟ یہ ابلیس کو ہے میر سامانی
خدا گھر اندھیرا اور چراغ دیر ہے روشن
رواج کفر پھیلا مضمحل ہے نور ایمانی
سواری لالہ و بابو کی کس بولش سیں جاتی ہے
کہ صوبہ دار ہندو اور ہے ہندو کو دیوانی
مسلماں کو نہیں توقیر کچھ ہی ان کی مجلس ہون
سلام اس طور سیں لیں سر سیں جوں کرتے نگرانی
در یغا پلہ کفار کا ہے اس قدر بھاری
کہ ہیں اب یہ مسلماں سب کم از پاسنگ میزانی
حمیت دین کی نہیں ہی ہے مسلمانو کو عالم موں
زہے غیرت زہے عار و زہے ننگ مسلمانی
ہر اک کافر کہے ہے سر موانا الدّجّال کا دعویٰ
نہ عیسیٰ چرخ سے اترے مٹے جو کفر کے بانی
نہ مہدی آئے جو یہ کفر سب مسمار ہوجاوے
چراغ کشتۂ اسلام پر گھر ہونے نورانی

جہاں اب قاف سے ہے قاف تک ظلمت کدہ سارا
کہ وہ ظلم سے روز سے شب دیجور ظلمانی
مگر زلف پری رویاں کو گھرے خواب موں دیکھا
کہ کرتی ہے در و دیوار سے بارش پریشانی
رباب و چنگ سے جانسوز تر ہے آہ مظلوماں
ہوا بیشہ نیستاں اور دل عالم نیستانی
رگیں نالاں تر ہیں تار رباب و چنگ بربت سے
کہ دست گوشمال چرخ سے عالم ہے افغانی
ہوا گوش فلک کا کر فغاں داد خواہاں سے
نہ کھولے کان گل کا نالہ ہائے مرغ شبانی

جہاں سے اٹھ گئی ہے اے عزیز و خیر و برکت سب
گئی مہر و محبت اور بڑھی ہے حرص حیوانی
نہ شفقت باپ کو بیٹے سے نہ مادر کو دختر سے
حسد بھائی کو بھائی سے کہاں ہے درد اخوانی
قناعت ہے کہاں عالم موں اب عقلائے مغرب سے
لجاجت اور سماجت کی نپٹ ہے گرم دکانی
وہاں مردم دانا کھلا رہتا ہے فاقہ سے
جو ناداں ہیں اونہوں کی ہے کمر موں زر ہمیانی

بجا ہے صاحب معنی جو نا پرساں ہو عالم موں
کرے کیوں کر کے ناداں مرد دانا کی قدر دانی
نہیں پوچھے ہے کوئی یاکوں کو ہر گز اس زمانہ میں
موقر ہیں کلوخ و سنگ استنجائے شیطانی
کمینوں کی بنی ہے اور نجیبانوں پہ حالت ہے
زمانہ منقلب برعکس ہے تاثیر دورانی

حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کے مرید اور شاگرد بہت زیادہ تھے۔ ان میں سے سید شاہ وارث علی، مفتی غلام مخدوم ثروتؔ، امان علی تزنیؔ، غلام شبلی وسعتؔ اور غلام جیلانی محزوںؔ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

(۸) **نور محمد دلدار** حضرت شاہ نور محمد دلدارؔ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) کے رہنے والے تھے۔ آپ حضرت شاہ مجیب اللہ صاحب پھلواروی کے مرید خاص تھے اور اس لحاظ سے حضرت سجادؔ اور حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کے ہم عصر بھی ہوئے۔ تمام تذکرے آپ سے بے خبر ہیں اور یہ حد درجہ افسوس اور حیرت کی بات ہے۔ آپ کے حالات زندگی کا صحیح پتہ نہیں چلتا، لیکن آپ کے کلام کا نمونہ دستیاب ہے۔ اور اس کے لئے پروفیسر حسن عسکری صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ان کے کلام کا مختصر سا مجموعہ بہار

ہسٹوریکل ریسیرچ سوسائٹی سے ڈھونڈھ نکالا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے ان کے بارے میں صدائے عام پٹنہ عید نمبر بابت سنہ ۱۹۵۳ء میں کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے حالات کا پتہ چلانے سے وہ بھی قاصر رہے لکھتے ہیں:۔

"دلدار کے حال یا کلام سے تذکرے خالی ہیں۔"

اب جو اُن کے کلام کا قلمی نسخہ بہار ہسٹوریکل ریسیرچ سوسائٹی میں مل گیا ہے تو ان کے متعلق تحقیق و تلاش جاری ہے۔ ان کے اس مجموعہ کلام میں دوسو چالیس (۲۴۰) اشعار ہیں۔ یہ سب ملتے جلتے اوزان و بحور میں ہیں۔ لیکن موجودہ علم عروض کے ذریعہ ہم ان کے صحیح بحر کا تعین نہیں کر سکتے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ "دلدار کے اشعار کی تقطیع عروض عرب و فارسی کے رو سے ہو سکتی ہے۔" لیکن ڈاکٹر اختر اورینوی اس کو عروض ہندی کے مطابق سمجھتے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس دور کے صوفیا کے کلام کی طرح ہندی عروض کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ اس ملواں زبان میں اور بالخصوص جبکہ عوام کی دلجوئی اور دلداری کا لحاظ رکھتے ہوئے حد درجہ ہندی الفاظ کا اس میں غلبہ ہو عربی فارسی عروض میل نہیں کھا سکتے۔

حضرت دلدار کے ان اشعار کو ہم غزل میں تو نہیں رکھ سکتے۔ البتہ چوپائی یا قطعہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ پورے "۲۴۰" اشعار میں، کہیں بھی انہوں نے دو سے زیادہ اشعار ایک زمین میں نہیں کہے۔ ہر مصرع

میں قافیہ ہوتا ہے اور چاروں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

حضرت دلدار چونکہ ایک صوفی شاعر اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے اس لئے ان کے کلام میں تصوف اور روحانیت کا بڑا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کا ہر شعر عارفانہ اور مذہبی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کی زبان پر مگدھی اپ بھرنش" کا بہت غلبہ ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر غفاؔ کی جواہر الاسرار یاد آجاتی ہے۔ وہی مذہبی اخلاقی مضامین اور وہی ہندی الفاظ کی کثرت اور پھر اس پر مقامی رنگ کا غلبہ۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کھیت کو من کے پریم کے ہل سے جوت کے چوکی درد کی کھینچ
گھاس دوئی کی کھود کے ساری کر وحدت کا کادو کھینچ
دانہ یاد کا بو کر اے دلدار فنا کا پانی سینچ
ہوگا حاصل بہتر اس کا خلل نہ ہوگا اس کو بیچ

جو صورت جدی جدی ہیں اک مانی کے جائے ہیں
کھانا دانہ ان سبھوں نے ایک خوان سے کھائے ہیں
کوئی مسلمان، کوئی یہودی کوئی ہندو دکھائے ہے
وحدت سے کثرت میں اور دلدار یہ سب......

پہلے میا موہ کو چھوڑ کے برے مارے تن کو
پیم کی آگ لگائے کے اے دلدار جلائے تن کو
یاد کی انجن سے پھر روشن دل کے کرے رتن رتن کو
ایسے جتن سے دیکھے تو تب اپنے مدن موہن کو

جن ہی ہوئے سکھی بھلا سو کرے لے مدھ ماتا
کہنا میرا دل میں تیرے کچھ بھی نہیں سماتا
وقت پڑے پر بھائی بیٹا کوئی کام نہیں آتا
ہو گا اے دلدار انہوں سے جیتے جی کا ناتا

---

(۹) میر وارث علی نالاں

میر وارث علی نالاں کے حالات زندگی ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں۔ یہ آخر بارھویں صدی ہجری کے ایک صوفی شاعر گذرے ہیں۔ ان کو بعیت غالباً سلسلہ فردوسیہ میں حاصل تھی۔ یہ خاص قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ لیکن قیام برابر عظیم آباد (پٹنہ) میں رکھتے تھے۔ اپنا اردو کلام اشرف علی خاں فغاں کو دکھلاتے تھے اور شعر و سخن میں انہی سے تلامذت حاصل تھی۔ نواب ابراہیم خاں خلیل نے اپنے تذکرہ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں

"نالاں عظیم آبادی میر وارث علی خلف میر ازانی

موطنش قصبہ بہار است۔ اما سکنے در عظیم آباد اختیار کردہ۔ بہ سرداری شیشہ گراں اعتبار دارد، جوان سنجیدہ اطوار، از تربیت یافتگان مرزا اشرف علی خاں فغاں ست۔ سال وفات ۱۱۹۹ھ ست۔"

جوشش نے بھی نالاں کی تاریخ وفات لکھی ہے :-

جوشش اس کے وفات کی تاریخ میر وارث غسلی نالاں ہے

ان کے متعلق بہت مختصر طور پر معاصر پٹنہ اگست ۱۹۴۱ء صفحہ ۳۷-۳۸ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

ان کے کلام کا نمونہ ڈاکٹر اختر اورینوی نے کتب خانہ مشرقیہ میں محفوظ گلزار ابراہیم کے قلمی نسخہ کے حوالے سے پیش کیا ہے :-

زلفوں میں جب میں تیری گرفتار ہو گیا آزادگی کے نام سے بیزار ہو گیا

نالاں اسیر زلف کو آزادگی کہاں اس پیچ میں پڑا سو گرفتار ہی رہا

آغاز محبت میں اگر جان نہ دیتے یہ کام کسی طرح سے انجام نہ ہوتا

پوجا کرے ہے جو کوئی دل کے کنشت کا اے شیخ معتقد نہیں وہ سنگ و خشت کا

یک بہ یک شام کو وہ یار جو گھر سے نکلا لوگ حیران ہوئے یہ چاند کدھر سے نکلا

قتل کو تیرا ہی مزاج نہیں — ورنہ میں کب کہا کہ آج نہیں

اے چشم راز عشق کو افسانہ کیجیو — ناحق کسی غریب کو رسوا نہ کیجیو

چین سے بیٹھنے کہیں نہ دیا — مجھ کو میری ہی بد گمانی نے

آنکھیں پرآب، خاک بستر، جیب چاک سے — نالاں یہ کیا ہوا تیری صورت بدل گئی

کل سے کچھ ہو رہے ہو برہم سے — ایسی تقصیر کیا ہوئی ہم سے

کس روز مری خاک پہ تو نے گذر کیا — آلودہ کب ہوا ترا دامن غبار سے

---

(۱۰) **غلام جیلانی محزوںؔ** حضرت غلام جیلانی محزوںؔ حضرت شاہ آیت اللہ کے مرید اور شاگرد تھے۔ آپ اردو اور فارسی دونوں کے مستند شاعر تھے۔ فارسی میں سرشارؔ تخلص کرتے تھے۔ اور ایک دیوان بھی فارسی کلام کا چھوڑا ہے لیکن ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ اردو میں محزوںؔ تخلص کرتے تھے۔ اور مراثی کی طرف زیادہ راغب تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہ

ان کے حالات زندگی یا کلام سے متعلق کچھ زیادہ مواد فراہم نہ کر سکے۔

پھلواری شریف مشائخ اور ان کی علمی اور روحانی سرگرمیوں کا مخزن رہا ہے اور ہے۔ وہاں اگر مزید کوشش کی جائے تو ممکن ہے نتیجہ خاطر خواہ نکلے۔

حضرت مخزوں کی پیدائش ۱۱۳۰ھ میں ہوئی تھی اور وصال ۱۲۰۲ھ میں پھلواری کے ایک مخطوطہ سے ڈاکٹر اختر اورینوی نے ان کے کچھ اشعار پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

چلا خنجر کٹا جب دم گلا شبیر سرور کا	زمیں لرزی فلک کانپا اٹھا تب شور محشر کا
عزیز و قصہ اندوہ و طومار جفا کوئی	لکھے کیا غم سے ہوتا ہے گریباں چاک دفتر کا
ہوا خورشید محشر کا جہاں میں ہر طرف روشن	بدن سے کاٹ نیزہ پر رکھا جب سر سرور کا
اگرچہ دست کوتاہ ہوں میں یہ مخزوں بچارا ہے	نہ چھوڑے گا قیامت بیچ دامن سبط سرور کا

پھلواری شریف کے جس مخطوطہ سے یہ مرثیہ نما غزل مخزوں کی نقل کی گئی ہے۔ اس کے آخر میں یہ دو سطریں لکھی ہوئی ہیں

"تمام شد غزل مولوی غلام جیلانی صاحب علیہ الرحمۃ متخلص بہ مخزوں در غزلیات فارسی کہ دیوان مرتب شدہ است تخلص ایشاں سرشار بود۔"

(۱۱) شیخ غلام یحییٰ حضور

حضرت شیخ غلام یحییٰ حضور اپنے دور کے مشہور مشائخ میں سے تھے سلسلہ چشتیہ میں آپ کو بیعت حاصل تھی۔ آپ کے والد ماجد شاہ محمد مظہر بن شاہ محمد اطہر بھی ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ حضرت شیخ غلام یحییٰ حضور ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک اچھے طبیب بھی تھے لیکن ذریعہ معاش کے لئے انہوں نے تجارت کو پسند کیا تھا اور اسی سے اپنی روٹی حاصل کر لیتے تھے۔ رشد و ہدایت مقصد حیات تھا۔ عوام کی خدمت اور تبلیغ اسلام میں اپنے اوقات زیادہ صرف کرتے تھے۔ صاحب سلسلہ بزرگ ہونے کی وجہ سے آپ کے مریدوں اور معتقدین کا حلقہ بہت وسیع تھا پیدائش کی تاریخ نہیں معلوم ہو سکی لیکن آپ کا وصال ۸ رجمادی الثانی روز جمعہ ۱۲۰۶ھ کو ہوا۔

حضرت حضور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ علاوہ غزل کے آپ کی کئی مثنویوں کا پتہ چلا ہے اور یہ سب خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے سجادہ نشین مولانا صبیح الحق صاحب کے پاس محفوظ ہیں درگاہ شاہ ارزاں پٹنہ سے آپ کو خاص عقیدت تھی اور اس کی توصیف میں آپ نے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ ایک مثنوی تو ۱۱۹۰ھ میں لکھی گئی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

مزار اس کی پہ گنبد نہیں ہے قبہ نور	وہاں ہے جلوہ نما کچھ عجب طرح کا ظہور
وہاں جو حوض نظر آتے ہیں وہ حوض نہیں	میں دیکھا چشم صداقت سے آج اس کے تئیں

اور ایک طرف سیس پری رو ہیں مایۂ تسخیر　　لئے دلوں کو پھنسانیکو زلف کی زنجیر

اور دوسری مثنوی جو شاہ ارزان کی درگاہ کی توصیف میں لکھی ہے۔ اس میں کے چوراسی (۸۴) اشعار محفوظ ہیں۔ اس قلمی نسخہ کے حوالے سے چند اشعار اس کے بھی درج ہیں:ــ

خدا اگر میری آنکھوں کو دیوے بینائی　　تو کیجئے عالم کثرت میں سیر یکتائی

گل ظہور سے اس کے ہے یہ جہاں گلزار　　جو چشم ہووے تو ٹک دیکھئے یہ باغ و بہار

بندھی ہے کیا ہی نہ آسمان یہ صورت دہر　　بسے ہیں صفحہ روئے زمین پہ کیا کیا شہر

....　　.................

غرض جو ہے تو یہی ہے کہ اس کو لوگ پڑھیں　　گناہگار ہوں شاید دعائے خیر کریں

حضرت حضور کی دو مثنویاں ہجویہ ہیں۔ ایک تو "ولائت رٹیرن" پر ہے اور دوسری کسی مہاجن کی ہجو میں ہے۔ "ولائت ریٹرن" پر ہجویہ مثنوی جو لکھی گئی ہے۔ وہ بہت بوسیدہ حالت میں ہے۔ نموننۃً تین اشعار درج ذیل ہیں:ــ

گر ولائت سے رزالا بھی یہاں آتا ہے　　اپنے تئیں عمدہ و اشراف ہی کہلاتا ہے

وہاں کے درزی کے کتر بیونت کی باتیں جو سنو　　اس کی قینچی سی زبان چلتے جو دیکھو تو کہو

ایسا کوئی صاحب تقریر نہ ہووے گا بشر　　جامۂ طرز سخن قطع ہوا ہے اس پر

ایک مہاجن کی ہجو میں جو مثنوی کہی ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں:ــ

مہاجن ایک ہے گر ذکر اس کے نام کا کیجئے　　تو ساری عمر بھر کھانے سے اپنا ہاتھ دھو بیٹھیے

گھو کو وقت کھانے کے اگر اس کا خیال آوے
تو ہر جا دل کا دانہ پارہ الماس ہو جاوے

....

اپنے گھر بیچ جو پالے ہے وہ مرغا مرغی
دانہ کھانے کے تئیں پاتی ہے کچھ کیا مرغی
ٹھونکتا جا ہے زمین پر کہ غذا ہو اس کی
صبح سے شام تلک ہنگی یہی خو اس کی
مرغی اس وقت نہ ہو اور کھنکھار آ جاوے
جمع کر منہ میں سکئے رہنا ہے جب تک آوے

اب آپ کی چند غزلیں بھی ملاحظہ ہوں :۔

(۱)

جو یوں آپ بیرون در جائیں گے
خدا جانے کس کس کے گھر جائیں گے
مسافر ہیں لیکن نہیں جانتے
کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے
تمنا میں بوسہ کی کہتا ہے جی
بدن سے نکل بھی اگر جائیں گے
تو ہے ایک دم اور ہزاروں امید
لبوں پر کوئی دم ٹھہر جائیں گے
یہ حرمت بنی اب تلک جس طرح
حضور اتنے دن بھی گذر جائیں گے

(۲)

آبرو الفت میں اگر چاہیے
رکھئے سدا چشم کو تر چاہیے
دل تجھے دے ہی چکے جان بھی
لیجئے حاضر ہے اگر چاہیے
دل بھی جواہر ہے ولیکن حضور
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

---

(۳)

منعم نہ ہو مغرور سدا پاس کسو کے | سیم و زر و گوہر نہ رہا ہے نہ رہیگا
گر عیش میسر ہو تو کر لیجیئے کم و بیش | سب وقت برابر نہ رہا ہے نہ رہیگا

---

(۴)

ہے افسوس اے عمر جانے کا تیرے | کہ تو میرے پاس ایک مدت رہی ہے
یہ طوفان اشک اس میں آنکھوں کی کشتی | تعجب ہے کیونکر سلامت رہی ہے

---

(۱۲) مفتی غلام مخدوم ثروت

حضرت مفتی غلام مخدوم ثروت پھلواری شریف کے رہنے والے ایک غریب گھرانے کے فرد تھے۔ آپ کے والد کا نام جمال الدین تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۹ھ میں وصال ہوا۔ شعر و سخن میں حضرت شاہ آیت اللہ جوہری کے شاگرد تھے۔ اور بیعت بھی ان کو غالباً ان ہی سے حاصل تھی ابتدائی زندگی تنگی اور عسرت سے کٹی لیکن آخر عمر میں کسی متروکہ مقدمہ کی بدولت ایک بڑی رقم ہاتھ آ گئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ بہت آسودہ اور خوشحالی کی زندگی گذار کر واصل بحق ہوئے۔

نجمی صاحب نے تاریخ شعرائے بہار میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اور ایک شعر بھی پیش کیا ہے:۔

چشم یہ مجھکو نہ تھی اے چشم گریاں اشک سے — آستین جو ہوگئی دریا بداماں اشک سے

اس کے علاوہ کوئی غزل ان کی اب تک دستیاب نہیں ہوسکی۔ البتہ پھلواری شریف کے مجموعہ مراثی میں ان کا بھی ایک مرثیہ ملتا ہے۔ یہ قلمی نسخہ حکیم شعیب صاحب مرحوم کے قبضہ میں تھا۔ اور اب ان کے ورثا کے قبضہ میں ہوگا۔ حضرت ثروت کا یہ مرثیہ ۶۲ شعروں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :۔

تمت المرثیہ فی سنہ ۱۲۱۲ یکہزار و دو صد دوازدہ ہجری

از تصنیفات مفتی غلام مخدوم صاحب علیہ رحمۃ متخلص بہ ثروت۔"

چند اشعار نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں :۔

(۱)

جب خاک پہ شبیہ اُترے خانہ زین سے — سر کاٹ لیا شمر نے آ خنجر کیں سے

اُس سر کو جو رفعت تھی سر عرش بریں سے — نیزہ نے رکھا سر پہ اُٹھا اُس کو زمیں سے

(۲)

بیٹھا جو اُتر گھوڑے سے وہ شاہ دلاور — تھے زخم لگے اُس تن نازک پہ بہتر

جیوں کرکے شفق میں ہو چھپا مہر منور — تھی چہرہ کی صورت بھی ہی خون جبیں سے

---

(۳)

وہ صید حرم ماندہ و مجروح تھا بیٹھا — تھے دام کے حلقہ کی طرح گرد سب اعدا

یوسف کا غرض دیکھ کے بگڑا ہوا سودا
دس تھے سگ گرگیں اٹھے ایکبارگی سے

(۴)

ان سب سگ ناپاک میں اک خوک شمر تھا
نہ شرم پیمبر سے نہ حق سے خطر تھا
دل اس سگ ناپاک کا سختی میں حجر تھا
اس سگ کو عداوت تھی مرے شبیر جری سے

(۵)

میں در کا گدا ہوں تیرا اور تو میرا شاہ ہے
تجھ مولیٰ کے ہاتھوں سے غلاموں کی نباہ ہے
ثروت ترا بندہ خدا اس کا گواہ ہے
واثق مجھے امید ہے تجھ حبل متین ہے

---

(۱۳) حضرت شاہ نورالحق تپاں پھلواروی

حضرت شاہ نورالحق تپاں پھلواری شریف کے ذی علم اور ممتاز مشائخ میں سے ایک تھے۔ آپ کے والد ماجد شاہ عبدالحق ابدال اور دادا حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی علوم ظاہری اور باطنی میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ حضرت تپاں کی پیدائش سنہ ۱۱۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ مولانا تمنا عمادی اور عزیزالدین بلخی مرحوم نے بھی حضرت تپاں کا ذکر کیا ہے اور سنہ پیدائش یہی لکھا ہے۔ حضرت سجاد حضرت نورالحق تپاں کے پھوپھا تھے۔ اور سسر بھی۔ حضرت سجاد کی وفات کے بعد ان کی خواہش کے مطابق ان کی جگہ مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں آپ اپنے لائق فرزند حضرت حافظ شاہ ظہورالحق کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنا کر خود گوشہ نشین ہو گئے۔ اور فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچے

کے لئے دن رات عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ مورخہ ۴ر شعبان ۱۲۳۳ھ کو آپ کا وصال بہ مقام پٹنہ ہوا اور پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔

آپ اردو اور فارسی دونوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اور شعر و سخن میں آپ حضرت سجادؔ کے شاگرد تھے۔ آپ نے اوراد و وظائف سے متعلق کئی رسائل بھی لکھے ہیں جو ان کے خاندان میں محفوظ ہوں گے۔ لیکن میری نظر سے نہیں گذرے۔ فارسی کے دو ضخیم کلیات کی نشاندہی عزیز بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف تاریخ شعرائے بہار میں کی ہے لیکن میری نظر سے یہ بھی نہیں گذری ہے۔ البتہ آپ کے اردو مراثی جو خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف میں محفوظ ہیں ان سے میں مستفید ہوا ہوں۔ حضرت تپاںؔ کے کچھ مرثیے ایک قلمی بیاض کی شکل میں پٹنہ سیٹی کی خانقاہ میں بھی ہیں۔ خانقاہ سلیمانیہ میں جو حضرت تپاںؔ اور ان کے فرزند حضرت شاہ ظہور الحق کے مرثیوں کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ان کے اختتام پر "المناک شد" "خونبار شد" اور "غمناک شد" لکھ کر سنہ تصنیف لکھا گیا ہے۔ ان مرثیوں کی کتابت ۱۳۰۷ھ کی ہے۔

جناب محی الدین تمناؔ پھلواری نے جنوری اور فروری ۱۹۴۲ء کے رسالہ معاصر پٹنہ میں حضرت شاہ نور الحق تپاںؔ کا تعارف کراتے ہوئے ان کی اکیس ۲۱ غزلوں کو بعض قلمی بیاضوں سے نقل کر کے شائع

فرمایا تھا۔ ڈاکٹر اختر اوریںوی نے بھی اپنی تصنیف میں اسی کے حوالے سے کچھ اشعار پیش کئے ہیں۔

اب ہم پہلے جگہ جگہ سے مراثی کا نمونہ پیش کریں گے۔ یہ مرثیے چوپائی کی شکل میں ہیں۔ پھر ان کی غزلوں سے کچھ اشعار نمونتہً دیئے جائیں گے:۔

(۱)

کوفی کی مکر جالی، ہے ہے یہ کیا بلا ہے
روباہی یا شغالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے
قتل حسین عالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے
اس مونہہ پہ خوں کی لالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۲)

کیا کہیے ہائے دل میں جز آہ کچھ نہ آوے
پانی کا ایک قطرہ آل نبی نہ پاوے
بڑھتا ہی لحظہ لحظہ دشمن کا فوج جاوے
اور قتل ہوں موالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۳)

پانی ملے کسی کو ہے ہے کہو کدھر سے
ظالم نے راہ روکا شمشیر سے سپر سے
مقتل پہ تشنگاں کی زہرا کی چشم تر سے
آنسو کی برشگالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۴)

تھی کربلا کے بن میں قاسم بنے کی شادی
شادی نہ کہیے اوس کو کیا کہیے نامرادی
اے دوستاں ستم ہے ظالم کی بد نہادی
دولہہ کی تنگ حالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۵)

کس چاؤ سے بنے نے خلعت زری کا پہرا
باندھا چچا نے تس پر ہاتھوں سے اپنے سہرا

تر ہو گیا لوہو سے دو ایک پل میں چہرا
تن ہو گیا گلابی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۶)

یہ دن دکھا کبھو مت کسھو کو حق تعالیٰ
دلہن کے پاس روئیں عورات کر کے نالا
دولہا بنے کا ڈوبا لوہو میں سر بالا
اور یہ بنی ہے بالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۷)

اکبر علی کی رن میں پھر جب گئی سواری
بابا کی چشم تر سے خوناب دل تھا جاری
کیا کہئے اے محبان بانو کی بے قراری
اور اوس کی نونہالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۸)

وہ دودھ جوانی بازو ہے ارغوانی
انگشتری کو جانے پاوے نہیں جوانی
کٹ کر گرا زمین پر جیوں سرو بوستانی
کھا تیغ پرتگالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۹)

وہ باغ مصطفیٰ کا خیبر میں نہال طوبیٰ
دلبند مرتضیٰ کا اور فاطمہ کا پوتا
شایاں تھا جس کے اوپر عالم نثار ہونا
اوس کی شکستہ حالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۰)

کیا کہئے تشنگی سے اصغر علی کا رونا
آغوش میں پدر کے چپکے شہید ہونا
پھر گرد زندگی کو لوہو سے سر کے دھونا
اور اوسکی خرد سالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۱)

اصغر کی لاش لیکر رن سے پھر سوے در
لوہو سے تا بدامن جیب اور کنار سب تر
گودی میں شہر بانو کی ہائے ہائے لیکر
لاش اوس بچے کی ڈالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۲)

آنسو سے خشک کب ہیں آنکھیں کہو کسو کی
یہ نالہ بے بیاں ہے بے نیت آرزو کی
روئے کو مومنوں کے یہ طرز گفتگو کی
گو سب سے ہے نرالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

---

(۱۳)

کسی سے غم کی خبر کہیے ہائے کیا کہیے
زباں ہے شعلہ اثر کہیے ہائے کیا کہیے
نہ کہیے کیوں نکلی اگر کہیے ہائے کیا کہیے
کٹا حسین کا سر کہیے ہائے کیا کہیے

(۱۴)

زماں زماں میں تو بڑھتا ہے اپنے دل کا محن
بدل ہو نالہ سے گر لائے زباں پہ سخن
بھرا کے مثل شفق خون دیدہ سے دامن
بگوش شام و سحر کہیے ہائے کیا کہیے

(۱۵)

وہ ماجرائے الم اب تلک ہے داغ جگر
جہاں تنور میں تھا حضرت شبیر کا سر
کھڑی جو روتی تھیں جنت سے بیبیاں آ کر
اب اوس کو بار دگر کہیے ہائے کیا کہیے

(۱۶)

وداع ہوش کیا سر نے تن نے تاب و تواں
گری وہ خاک پہ بیہوش ہو کے نالہ کناں
فغاں سے حضرت زہرا کے یہ قریب تھا کہ
پھٹا جہاں کا جگر کہیے ہائے کیا کہیے

(۱۷)

یہ سر ہے حضرت زہرا کے نور دیدہ کا
کہ جس پہ کرتی ہیں جنت سے آ کر حور بکا
کہے پلید اسے کس گناہ پر کاٹا
چلا ہے لیکے کدھر کہیے ہائے کیا کہیے

(۱۸)

نو دلبران پیمبر کے تئیں یتیم کئے
تو دختران علی پر ستم عظیم کئے
خراب خانۂ دین اپناں اے لئیم کئے
جگہ تری ہے سقر کہیئے ہائے کیا کئے

(۱۹)

غم حسین میں اٹھتا ہے آسماں سے خروش
طپاں زمین کے بھی جنبوں سے اشک کا ہے جوش
کہو تو جس کے بیاں میں ہو جبرئیل خموش
کہاں ہے حد بشر کہیئے ہائے کیا کہیئے

غزل سے کچھ اشعار کا اقتباس :ـــ

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا
عقل کو چھوڑ دیا تو نے تو ہشیاری کی
پڑ گیا نام تپاں کیونکہ دوانہ تیرا

ناشاد نہیں بلبل ناشاد کے ایسا
پھر بھی وہ نہیں اس دل برباد کے ایسا
ایمان کی یہ بات تپاں ہم تو کہیں گے
استاد نہیں حضرت سجاد کے ایسا

عزم آنے کا جو وہ لے دل بیتاب کریں
فرش ہم راہ میں جا دیدۂ بیخواب کریں
لے گیا ہے تو کریں قدر بھی میرے دل کی
آپ برباد نہ یہ گوہر نایاب کریں

بیچ دیویں گوہر دل کیوں نہ اس دلبر کے ہاتھ
قدر جوہر ہے لگے گر صاحب جوہر کے ہاتھ
جھکتے ہیں آ دے دست بوسی کے لئے پیر فلک
لو نہ انگڑائی خدا را دونوں اوپر کو ہاتھ

ہوش بھی کوئی شئے ہے رکھنے کی ۔۔۔ عقل سے کچھ تو کام کوئی لے
دیوے پر چاک نہ چشم ساقی گر ۔۔۔ کیوں بڑھا ہاتھ جام کوئی لے

مارتے ہیں نظر کے بھالے سے ۔۔۔ اور دیکھے ہیں بھولے بھالے سے
چارہ گر! ٹک سمجھ سے بھی لے کام ۔۔۔ موت ٹلتی نہیں ہے ٹالے سے
مونہہ سے خم ہی لگا دے اے ساقی ۔۔۔ کون پیتا رہے گا پیالے سے
اپنی کملی ہی میں مگن ہے تپاں ۔۔۔ کام کیا شال سے دوشالے سے

پانی کی جگہ مے تھی تو مٹی کی جگہ درد ۔۔۔ سرمستِ ازل سے ہے مری آب بھی گِل بھی
ہم جان رہے تھے کہ فقط زلف ہے آفت ۔۔۔ واللہ غضب ہے ترے رخسار کا تِل بھی

اک خواب سے بڑھ کر نہیں یہ ہستی موہوم ۔۔۔ وہ خواب جو شرمندہ ہے تعبیر کے آگے

جی تو چاہے ہے بہت قاتل! مگر ۔۔۔ ہائے کب جی بھر کے تڑپا جائے ہے
تیرے عاشق تیرے شیدا کا یہ حال ۔۔۔ ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے
لگ گئی ہے آگ سی سینے کے بیچ ۔۔۔ اور دل کمبخت بجھتا جائے ہے
کب مٹے ہے دل سے یادِ روئے یار ۔۔۔ سر سے کب زلفوں کا سودا جائے ہے
منزلِ مقصود پاوے ہے وہی ۔۔۔ جو ترے رستہ میں کھویا جائے ہے

اٹھ رہا ہے درد دل جب بار بار
دل سے پوچھو کا ہے بیٹھا جائے ہے
اب بلاوا آ رہا ہے یار کا
دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے

دل کو سمجھا دیں ہیں یہ کہہ کہہ گئے ہم
یار بس اب آئے ہے اب آئے ہے

اللہ رے امید رہیں کوئی آئے نہ جاوے
ہے در کی طرف آنکھ کہ شاید کوئی آوے

دل مرا میری نہیں کہتا تو پھر میرا نہیں
جب تمہارا ہی یہ گاتا ہے تمہارا ہو گیا

لگا دی اپنی آنکھوں سے جھڑی خود آخرش ہم نے
کہ رستہ کب تلک اے ابر رحمت دیکھتے رہتے
پڑھایا حضرت واعظ نے آخر ہاتھ ساغر پر
فقط بیٹھے ہوئے حضرت سلامت دیکھتے رہتے

بتکدے میں تم پہ کیا گزری بتاں بتلاؤ تو
بیٹھ کر مسجد میں کیوں یاد خدا کرنے لگے

---

(۱۴۲) غلام علی راسخ

حضرت شیخ غلام علی راسخ حضرت شیخ محمد فیض کے فرزند تھے۔ تذکرہ گل رعنا اور دوسرے تذکرے اس پر متفق ہیں کہ آپ کی پیدائش موضع سائیں ضلع گیا (بہار) میں ہوئی تھی۔ پٹنہ سے بیس ۲۰ میل کے فاصلہ پر یہ سادات کی ایک قدیم بستی تھی جو ۱۹۴۶ء کے قتل عام میں مکمل

طور پر ویران ہوئی۔ حضرت راسخ کی پیدائش ۱۱۶۲ھ میں ہوئی تھی اور اس پر تقریباً سب ہی متفق ہیں لیکن سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ بقول حمید عظیم آبادی:۔

"راسخ مرحوم کے سال ولادت میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ آپ کی ولادت کا سال ۱۱۶۲ھ ہے۔ لیکن سالِ وفات میں اختلاف ہے۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے گلشن بیخار میں سال وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے اور گارساں دتاسی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ لیکن ان دو کے علاوہ تقریباً سب ہی تذکرہ نگاروں نے ان کا سنہ وفات ۱۲۳۸ھ لکھا ہے۔ بالخصوص ان کے شاگرد یاس اردی جن کو اپنے استاد حضرت راسخ سے بہت قربت حاصل تھی حضرت راسخ کے سال وفات کے بارے میں ذرا تذبذب نہیں رکھتے لکھتے ہیں:۔

"الحال تاریخ رحلت شیخ غلام علی راسخ بہ تلاش و تجسس کما ینبغی بہ دریافت رسید کہ تاریخ بستم جمادی الاولی ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ بودہ است۔"

حضرت راسخ ایک ذی علم انسان اور اردو و فارسی دونوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو میں حضرت فدوی کے اور فارسی میں

۱۔ راسخ از حمید عظیم آبادی ص۱۵ ۔ ۲۔ بہار میں اردو زبان کا ارتقا از اختر اورینوی ص۳۰

اس وقت وہ خود ایک صاحب کمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ اور اصلاح سے بے نیاز تھے لیکن جب میر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ شعر اپنے تعارف کے سلسلے میں پیش کیا:۔

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم اہل راہ کا
آنکھ والا ہے سمجھے مجھ غبار راہ کا

میر صاحب اس شعر پر جھوم گئے اور اٹھ کر محبت سے گلے لگالیا پھر جب اصلاح کلام کی درخواست کی تو فرمایا۔ "میاں تم اصلاح سے بے نیاز ہو"۔

قاضی عبدالودود صاحب نے بھی اپنے ایک مقالہ (مطبوعہ صدائے عام عید نمبر ۱۹۵۳ء صہ ۲۱) میں اس مختلف فیہ مسئلہ کی اسی طرح توجیہہ پیش کی ہے۔ لکھا ہے:۔

"راسخ بہ حیثیت مجموعی بہار کے قدیم شعرائے اردو میں سب سے بڑے ہیں۔ یہ ابتدا میں فدوی کے شاگرد عشق دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے اور اس کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ قلمی دیوان میں جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ (کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) یہ شعر موجود ہے:۔

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار
راسخ ہوں ایک میں بھی دلے کس شمار میں

عشقی نے لکھا ہے کہ راسخ کو میر سے بڑی عقیدت تھی اور ان کی کشش ان کو لکھنؤ لے گئی جہاں وہ میر کے

حضرت شاہ نورالحق تپاںؔ پھلواروی[۳] کے شاگرد تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کو میرؔ کا شاگرد بھی لکھا ہے اور اتفاق سے دونوں کی تلامذت کا اعتراف خود حضرت راسخؔ نے اپنے اشعار میں کیا ہے مثلاً:

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بیشمار ۔۔۔ راسخ ہوں ایک میں بھی وہ کس شمار میں

راسخ کو ہے میرؔ سے تلمذ ۔۔۔ یہ فیض ہے اون کی تربیت کا

زندہ ہے نام میرؔ راسخ سے ۔۔۔ کون ہے شاعروں میں ایسا آج

اس بارے میں مطابقت پیدا کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان کو دونوں صاحب کمالوں کا شاگرد تسلیم کر لیا جائے اور وہ اس طرح کہ ابتدا میں انہوں نے حضرت فدوی کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھایا اور پھر جب وہ لکھنؤ تشریف لے گئے تو وہاں میرؔ کے کمال شاعری سے متاثر ہو کر ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اور حقیقتاً ان کو اپنا کلام دکھایا۔ جیسا کہ میں نے اپنی تصنیف "بہار اردو شاعری" میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ جس وقت حضرت راسخؔ لکھنؤ تشریف لے گئے تھے

[۱] اپنے مقالہ راسخ میں حمید عظیم آبادی نے خاتم سلیمانی حصہ چہارم صفحہ ۱۵ الملفوظات ۲۲۸ سے یہ عبارت نقل کی ہے "ہمارے ہاں بھی راسخ مرحوم کی تحریریں موجود ہیں وہ اپنا فارسی کلام تو پھلواری کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت تپاں کو دکھاتے تھے۔"

حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے"۔

راسخ عظیم آبادی زیادہ تر عظیم آباد پٹنہ میں رہتے تھے۔ سائیں ان کا دیہی مسکن تھا۔ لیکن ۱۱۸۲ھ سے ۱۲۳۲ھ یعنی تقریباً چالیس برس تک یہ اکثر اپنے وطن سے باہر رہے اور دہلی، لکھنؤ، مونگیر، بھاگلپور، مرشد آباد اور کلکتہ کی سیاحت کرتے رہے اور جہاں جاتے علمی اور ادبی مجلسوں کی کشش سے کافی عرصہ تک مقیم ہو جاتے۔

حضرت راسخ ایک صوفی منش بزرگ تھے اور حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی کے مرید خاص تھے۔ آپ نے زندگی بہت عابدانہ اور زاہدانہ بسر کی۔ آپ کو اپنے پیر سے حد درجہ عقیدت اور محبت تھی، آپ نے اپنے پیر و مرشد کو جو خطوط لکھتے ہیں ان میں سے اکثر بڑی خانقاہ پھلواری شریف میں محفوظ ہیں۔

حضرت راسخ کے شاگردوں میں مندرجہ ذیل کئی شعراء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انور علی یاس آروی۔ حکیم احمد حسین، خواجہ فیض اللہ معروف بہ شاہ غلام، مخدوم فرحت عظیم آبادی۔ خواجہ محمد محسن۔ مرزا مراد بخش مراد۔ نواب مہدی علی خاں۔

۱۳۱۱ھ میں کلیات راسخ خیر المطالع عظیم آباد سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب کمیاب ہے۔ کلیات راسخ کے تین قلمی نسخے کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں محفوظ ہیں ان میں سے ایک نسخہ خود حضرت راسخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور ایک چوتھے نسخے کی نشان دہی ڈاکٹر اختر

اور مثنوی نے بھی کی ہے جو برج راج صاحب پٹنہ سیٹی کا ہے۔

کلیات راسخ میں دس قصیدے، چند قطعات، رباعیاں، غزلیں اور آخر میں مختلف مثنویاں ہیں۔ قصائد میں نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی شان میں لکھے گئے قصیدے بھی ملتے ہیں ایک قلمی نسخہ میں تین ہزار ابیات پر مشتمل مثنویاں بھی ملتی ہیں۔

راسخ عظیم آبادی کی قادر الکلامی اور شاعرانہ مہارت پر تقریباً سبھی نقادان سخن متفق ہیں۔

رسالہ اردوئے معلیٰ[1] میں ایک جگہ مولانا حسرت موہانی نے راسخ کی مثنویوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ "راسخ کی مثنویوں کا انداز میر کی مثنویوں سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں میں تمیز بھی مشکل ہے۔"

بلخی مرحوم نے اپنی تصنیف "تذکرہ شعرائے بہار" میں لکھا ہے:

"راسخ کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ تصوف کا رنگ بہت نمایاں ہے"

قاضی عبد الودود صاحب کا خیال ہے کہ" اور اصناف کے مقابلہ میں راسخ غزل اور مثنوی میں زیادہ کامیاب ہوئے۔

حضرت راسخ کی مثنویوں کے نام یہ ہیں:۔ مثنوی حسن و عشق، مثنوی ناز و نیاز، مثنوی نور الانظار، مثنوی جذب عشق۔ مثنوی مکتوب شوق، مثنوی کشش عشق، مثنوی گنجینۂ حسن، مثنوی سبیل نجات مثنوی نیرنگ محبت، مثنوی اعجاز عشق۔ مثنوی مراۃ الجمال، مثنوی

---

[1] رسالہ اردوئے معلیٰ بابت مئی سنہ ۱۹۰۷ء

شرحِ حال، مثنوی شہر آشوب، مثنوی مدحیہ۔ ان میں سے مثنوی حسن و عشق اور مثنویِ جاذبِ عشق کے چند اشعار علیحدہ علیحدہ بطور نمونہ درج ذیل ہیں:۔

کاہش ہے غموں کی پیہم جہاں ہوں | مانند ہلال ناتواں ہوں
کچھ حال نہیں ہے بائے تن میں | ہوں تار کی طرح پیرہن میں
غم پر اک غم دیا فلک نے | تاراج مجھے کیا فلک نے
یغما سے اس کی کیا ہے باقی | یک تار نفس رہا ہے باقی
سودہ کبھی آمادہ گسستن | یہ چرخ ہے میرے جی کا دشمن
آرام کا عرصہ بس کہ ہے تنگ | دل تنگی سے ہے عجب مرا رنگ
اس دائرۂ فلک میں مجبور | ہوں نقطے کی طرح آہ محصور
کیا کہیئے خمیدہ آسماں کو | گر ہاتھ چلے تو اس کمان کو
یاں تک کھینچوں کہ ٹوٹ جائے | کب تک صدمے کوئی اٹھائے

(مثنوی حسن و عشق)

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق | شمع ایوانِ کبریا ہے عشق
آب گوہر ہے اور آتش سنگ | ہر جگہ اس کا اک نیا ہے رنگ
خوں ہو برسا ابر مژگاں سے | ٹپکا آنسو ہو چشم گریاں سے
تپ غم ہو کے استخواں میں رہا | ضعف ہو جان ناتواں میں رہا
گاہ رسوا کہیں رہا اک عمر | کہیں پردہ نشیں رہا اک عمر

گاہ محفل نشین ناز ہوا کہیں سرتا قدم نیاز ہوا
کوچۂ نے سے نالہ ہو نکلا خاک گلشن سے لالہ ہو نکلا
روشن اس سے جان کا کاشانہ ہے پتنگا اسی پہ پروانہ
بزم اسی سے ہے پرنور ذرہ تا مہر ہے اسی کا ظہور
بلبل آشفتہ ہے سدا اس کی ہے گل تازہ کو ہوا اس کی
سینے میں ہو کے دل دھڑک اٹھا کہیں شعلہ ہوا بھڑک اٹھا
(مثنوی جذب عشق)

آخر میں ان کی غزلوں میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبار راہ کا

طالبان یار کی منزل تو غیر از دل نہیں کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

مت پوچھے مجھ سے حال میرا حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

ضبط گریہ تو ہے پر دل پہ جو ایک چوٹ سی ہے
قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے محبوب اپنا
کوئی بھی اُوس کی تجلی نہیں تکرار کے ساتھ

برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے
کچھ کہا اس نے نہ لیکن اک تبسم سا کیا

آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے
جن سے ٹک آشنا ہوئے ہو تم

خموشی کے پردے میں ہے شور میرا
مجھے چپ نہ جانو سراپا فغاں ہوں

عذر خواہی کا اب دماغ نہیں
خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تم

جز داغ ہے کیا دل حزیں میں
لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

دل کیوں نہ عزیز مجکو ہوئے
ہے نام تمہارا اس نگیں میں

مجھے تو رفتگی سی تھی میں اسکو کیا جانوں
تمہیں کہو کہ لیا تم نے کس ادا سے دل

ہم مصیبت کشتوں کے دن نہ پھرے　　　گو زمانہ کو انقلاب رہا

مرنا اس بن کہ جیتے رہنا　　　راسخ کہو کیا قرار پایا

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انہوں پہ ہے
جنہیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

اٹھا دیں کس روش اس باغ دل کش سے دل اپنا ہم
کہ ہر کانٹے سے یوں الجھا ہوا اپنا تو داماں ہے

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

خون بہا میرا یہی ہے کہ کہو　　　یہ میرا کشتۂ تمنا ہے

لذتیں غم کی تیرے ہو جیو راسخ پہ حرام　　　دل میں کچھ اور اگر غم کے سوا رکھتا ہے

رُخ زیبا دیا گل کو دل بے صبر بلبل کو　　　اسے خنداں کیا پیدا اسے گریاں کیا پیدا

مری متاع عجز بھی کی ناپسند ہائے
بولے کہ اس متاع پہ تجھکو غرور تھا

دکھلائے ترک جو نظارۂ دلدار کیا
ہائے پرہیز نے دونا ہمیں بیمار کیا

تم نے رآسخ تن عریاں پہ جو توڑے ناخن
کیا نمک پاشی کا اس شوخ نے اقرار کیا

کہاں کی لیلیٰ و مجنوں سب یہ سمائے فرضی ہیں
مسمیٰ اور ہی تھے تھا نہ لیلیٰ اور مجنوں تھا

چراغ خانہ مت سمجھو چراغ عشق کو رآسخ
کہ اس میں چاہیے روغن پر اس میں خون نمنلی کا

فردوس سے وہ نکلا ہیں کوچۂ جاناں سے
رونے کو مرے پہنچا رونا کہاں آدم کا

پابند تعلق نہیں ہوتا عاشق
آزاد ہے ہر شے سے یہ آزاد محبت

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا
دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا

کفر بھی اک شان جلوہ بھی اسی دلبر کی ہے
شیخ کیوں تو برہمن سے برسر پیکار تھا

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا
بہت فرزانہ ہے دیوانہ تیرا

(۱۵) شاہ امان علی ترقیؔ

حضرت شاہ امان علی ترقیؔ پھلواری شریف کے ایک صاحب علم وفضل بزرگ گذرے ہیں۔ شعر وشاعری کا بھی ذوق تھا لیکن ان کے کلام میں صرف مرثیے ملتے ہیں۔ ان کے حالات وکلام دونوں ابھی تک بہت کم منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کے مرثیوں کا ایک قلمی نسخہ پھلواری شریف میں موجود ہے۔ جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں۔

"تمت المرثیہ من ترقیؔ رحمۃ اللہ تعالیٰ فی ۱۲۲۷ھ

یک ہزار ودو صد بست وہفت ہجری"

حضرت شاہ امان علی ترقیؔ کو بیعت شاہ آیت اللہ مذاقیؔ سے حاصل تھی۔ اور قرینہ اغلب ہے کہ کلام بھی ان ہی کو دکھلاتے ہوں گے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب "بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا" میں ان کی پیدائش کا سال ۱۱۸۰ھ اور وفات کا سال ۱۲۵۵ھ لکھا ہے۔ ان کے مراثی کا نمونہ درج ذیل ہے:

(۱)

شب عاشور جو کی شہ نے عبادت میں بسر | غم فرقت سے ہوئی چاک گریبان سحر
کہا سجاد کے تئیں سرور دیں نے رو کر | آج ہووے گا جدا تن سے ہمارا یہ سر

نقد جاں را بره دوست فدا خواہم کرد
سر خود گوئے بہ میدان رضا خواہم کرد

(۲)

ہم نے شب خواب میں دیکھا ہے کہ مادر زہرا
ہوئیں اس دشت بلاخیز میں جلوہ فرما
اپنے گیسوے سمن سائے کو جاروب بنا
خار و خاشاک کو اس دشت کے کرتیں ہیں صفا

صاف میدان بلا ساختہ گیسوئے بتول
نور پیدا شدہ ہر گوشہ از رمئے بتول

(۳)

داستان غم شبیر نہایت ہے دراز
جس کے یک حرف کے سننے سے جگر ہوے گداز
ہو نہیں سکتا قلم یک سر و شرح طراز
کر ترقی شہ کونین سے تو عرض نیاز

اے شہ از لطف دہی دولت دیدار مرا
کہ بود در دو جہاں با تو سرو کار مرا

---

(۱۶) حضرت شاہ ظہور الحق ظہورؔ پھلواروی

حضرت شاہ ظہور الحق ظہورؔ حضرت شاہ نور الحق تپاںؔ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ آپ کے والد ماجد نے اپنے ہونہار فرزند کے کسب و ریاضت اور علم و فضل کو دیکھ کر اپنی زندگی ہی میں اپنی جگہ خانقاہ عمادیہ کا سجادہ نشیں بنا دیا تھا اور خود گوشہ گیر ہو کر فنا فی اللہ کی منزل میں منتقل ہو گئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت سجادؔ کی صاحبزادی بھی بہت ہی پاکیزہ صفت اور خدا ترس خاتون تھیں۔ حضرت شاہ ظہور الحق ظہورؔ رح کی پیدائش ۱۱۸۵ھ میں اور وفات ۱۲۳۴ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی اپنے والد ماجد کی وفات سے صرف ایک سال بعد۔ آپ نے

بہت کم عمر پائی یعنی صرف انچاس (۴۹) برس کے سن میں انتقال فرمایا۔آپ اپنے وقت کے بہت ذی علم بزرگ تھے۔ آپ کے علم وفضل اور کسب وریاضت کی آپ کے معاصرین میں کافی شہرت تھی۔آپ نے اپنی زندگی خدمتِ خلق۔ رشد وہدایت اور تبلیغ مذہب کے لئے وقف کردی تھی۔ آپ کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر قدرت تامہ حاصل تھی۔ آپ فارسی اور اردو دونوں کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ لیکن ایک حادثہ کے سلسلہ میں ان کا سارا کلام جس میں فارسی اور اردو کے دواوین ہیں، ضائع ہوگیا۔ آپ نے اردو میں عوام کی ہدایت اور رہبری کے لئے کئی رسالے بھی لکھے ہیں جو خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ لیکن آپ کی بہت سی گراں قدر تصنیفات اسی حادثہ کا شکار ہوئیں۔ مولانا محی الدین تمنا عمادی پھلواروی نے اپنے ایک مضمون[1] میں اس حادثہ کی تصریح اس طرح فرمائی ہے:۔

"۱۲۳۰ھ میں بعض اقارب کا لعقارب کی طویل اور مسلسل ستم کیشیوں سے تنگ آکر حضرت مولانا ظہور الحق محدث کو اچانک شب کے وقت گھر چھوڑ کر پٹنہ سیٹی چلا آنا پڑا۔ اور ہجرت کے وقت کچھ ضروری تبرکات اور کتب ضروریہ کے سوا کچھ سامان ساتھ نہ لے جاسکے۔ جب پٹنہ میں قیام کا انتظام قابل اطمینان ہوگیا

[1] معاصر پٹنہ بابت جنوری ۱۹۴۲ء

تو تیسرے دن کچھ لوگوں کو پھلواری روانہ کیا تاکہ باقی
کتابیں اور سامان وہاں سے لے آئیں مگر آنے والوں
نے مکان کو بالکل جلا ہوا ایک تودۂ خاک پایا۔ اور کوئی چیز
لانے کے قابل نظر نہ آئی ۔ وہ مولانا کے پاس ناکام واپس
آئے اور حالت بیان کی۔ مولانا نے فرمایا خوب شد آئینہ
خود بینی شکست۔ الحمد للہ علی کل حال۔ حضرت نور الحقؒ
تپاں، حضرت سجادؒ اور خود حضرت مولانا ظہور الحق ظہورؔ کے
دواوین فارسی و ذخیرہ کلام اردو اور اکثر تصنیفات تالیفات
اور نیز بعض بزرگان پیشیں کی بعض اہم تصنیفیں اسی سلسلے
میں ضائع ہوگئیں "۔

اس وقت آپ کے اردو نظم میں کچھ مرثیے ملتے ہیں جو مخطوطہ کی شکل
میں پھلواری شریف خانقاہ سلیمانیہ میں محفوظ ہیں۔ یہ کل اکتیس (۳۱) مرثیے
ہیں۔ ان میں سے دو مرثیوں کے اقتباسات نمونہ کے طور پر درج ذیل
ہیں۔ ایک مرثیہ چھبیس (۲۶) بندوں پر مشتمل ہے۔ اور چوپائی کی شکل میں ہے
اس کی کتابت سنہ ۱۲۱۸ھ کی ہے کیونکہ مرثیے کے آخر میں " غمناک شد
سنہ ۱۲۱۸ء " لکھا ہوا ہے :۔

(۱)

کہیں سکینہ بابے رے بابل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو
دیس پرانا چھو اور جنگل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

تج دیو نگری اپنو رکھوال گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو
بابل مورا جوگے راول گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۶)

اپنی بپتا میں کا سے کہوں اب جیرا نکسے نہ موہے چیان
آٹھ پہر موہے کل نہ پڑت ہے نیند نہ آوے دنن نہ رتیاں
آنسون کے توجھڑی لگا یو رکت ہے رووت مورے نیناں
دیکھو نہ بابل انوکھا یہ بادل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۷)

نگر براناں لوگ بگانا ٹھا رہے رووں ہوں اکیلی بن میں
سون دیکھاوے جی ڈریاوے لوٹھ پہ لوٹھ نہاروں ون میں
لوہو آگ لگا یو بن میں سلگت آ مورے تن من میں
بابل گگرا کے ہمرا سو پل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۳)

کا کے ہیں ہاتھ پٹھاروں سندیسا کا کروں گن سن مورے دیا
کہت رہوں میں لکھیاں نہ پتیاں عابد مورے بیرن بھیا
بابل رووے کت کنا باں ایسا نون کا ہے بدیسوچیا
موسو کہت نہ ستت گیلو سل پل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۸)

موہے کچھو نہیں بھاوت بابل کہک کہک مورے بتیں رتیاں

آپ آوت ناہیں بابل نا لکھ بھجیاں توں موہے پتیاں
سوہنی مورت توری بابل لکھت رہوں ہم اپنی چھتیاں
نینن سو مورے توں جو رہت ٹل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۹)

دھوبیا کا پردھوے بابل داگ نہ دھوے کوٹ د میرو
آگ لوہے کی بجھاوے نہر دا آگ نہ کھوٹ کوٹ د میرو
اپنوں کلیجا آپ ڈست ہوں ناگ نہ ہووے کوٹ د میرو
تم بن بابل ہم بھیو بیکل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۰)

کا پر میرو ٹل بھیو بابل بھیلو بال ہمارو لٹا
دھول بینوا ں لگ لگ سیسن پھوٹے جیون جوگی نون جٹا
سیندر تیل سب چھوڑا بابل تورے کارن جیو بھیو کھٹا
رووت ڈہر ڈہر جات مورا کا جل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۴)

ہم جو جانت تم ہو جوتیا سیس تھارو پاین دہر تیوں
جے تم کام کہت ہے کر تیوں پنیا سسین بھر تیوں
ہم سوں کہہ کے جو جا تیو بابل جتر ا کر کے بدا نجھو کر تیوں
جاوں گیلو ہو دن منگل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۶)

بس اے ظہور اب اگان بس کے بسکی غم کی بتیا بس کے
نکسے نہ بیر کہو ہٹین کا ۱ہ پانگی میں کد ہوں ڈھنس کے
کالی ناگن درد کی نکست گیو پھر لوگاں کو ڈس کے
سرور گیلو پر گئی کھل بھل گیلو سو گیلو ہے گیلو

حضرت شاہ ظہور الحق ظہور کا دوسرا مرثیہ جو اس قلمی نسخہ میں شامل ہے۔ بتیس ۳۲ بند پر مشتمل ہے۔ اس میں سے بطور نمونہ کئی جگہ سے پانچ بند درج کئے جاتے ہیں :ـ

(۱)

بلبل چمن میں ہے غم قاسم سے نوحہ گر — گل نے کیا ہے جیب و گریباں لہو سے تر
غنچہ جھکا کے سر کو ہے ہوکے گریہ در — کٹتا ہے آج قاسم نوکد خدا کا سر

(۲)

باغ نبی پہ آج خزاں کی ہوا بہی — شمشاد مجتبیٰ کو ملا تخت نوشہی
لیکن کہاں کسی کو حقیقت سے آگہی — ایسا ہے تخت تختۂ تابوت سے بتر

(۳)

دو عندلیب باغ رسالت امام دیں — یعنی کہ قاسم ابن حسن سرور زمیں
جس کی لگن لگی گل شبیر سے کہیں — لگن جدا چمن سے رہا زار و نوحہ گر

(۳۱)

خلعت تمام خوں سے بھرا ہائے ہائے ہائے — سہرا لہو سے سرخ ہوا ہائے ہائے ہائے

زخموں سے رشک باغ ہوا جسم سر بسر
بدلے حنا کے خوں ہی لگا ہائے ہائے ہائے

(۳۲)

دیدم بوقت صبح کہ گلزار مر گریست
گل جامہ چاک کردہ ببازار مر گریست

در بوستاں ظہور دل افگار مر گریست
چوں عندلیب نالہ سرا بود گریہ در

حضرت شاہ ظہور الحق ظہور کے نثری نمونے کے طور پر ہیں ان کے صرف چار مذہبی رسالے ملتے ہیں اور وہ ہیں نماز، فضائل رمضان، فیض عام اور کسب النبی۔ یہ چاروں رسالے خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اور ان پر جناب زخشاں ابدالی صاحب نے اپنے مقالہ[1] مطبوعہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ رسالہ نماز اور فضائل رمضان کا سنہ تصنیف احسان ابدالی صاحب نے سنہ ۱۲۰۰ھ متعین کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"اتنا تو یقینی ہے کہ یہ دونوں رسالے (یعنی رسالہ نماز اور فضائل رمضان) سنہ ۱۲۰۰ھ سے قبل لکھے گئے کیونکہ یہ اور بعض دوسرے رسالے حضرت مصنف نے اپنے ایام طالب علمی میں لکھے تھے اور آپ پورے سنہ ۱۲۰۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں"۔

بقیہ دو رسالوں کے سنہ تصنیف کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ فیض عام کا سنہ تصنیف ۱۲۲۸ھ اور رسالہ کسب النبی کا ۱۲۳۱ھ ہے۔

رسالہ نماز کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

"نماز تہجد کی بارہ رکعت ہے۔ بعد نیند سے اٹھنے

---

[1] اردو دنثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ۔

کے دوگانے دوگانے پھر دوگانے کے بعد توبہ اور استغفار
اور سب کے بعد مناجات۔ اور بعد اس کے خدا کی یاد کرے۔
بلکہ صبح تک جو توفیق ملے"۔
رسالہ فضائل رمضان کی عبارت کا نمونہ:۔
"ہلال رمضان دیکھ کر پڑھے: اللھم سلّمی من
رمضان سلمہٗ منی اللھم ارزقنا صیامہٗ وقیامہٗ و
تلاوۃ القرآن بالقلب واللسان۔ ایضاً ہر روز شب
سورہ اخلاص تین سے بہتر مرتبہ پڑھا کرے۔ حق تعالیٰ اس
کے بدن کو جہنم پر حرام کر دلیوے"۔
رسالہ فیض عام کا انداز تحریر ملاحظہ ہو:۔
"اس سال پہلے ہجرت کے کتنے واقعے درپیش
ہوئے پہلا تو مسلمان ہونا عبد اللہ بن سلام یہودی کا کہ
مدینہ میں رہتے تھے اور اپنی قوم میں تھے۔ بہ مجرد مشاہدہ
کرنے شواہد کے خود اور چند یاراں کے دولت اسلام
سے مشرف ہوئے۔
دوسرے عہد مواخات باندھنا۔ حضرت نبینا صلی اللہ
علیہ وسلم کا درمیان ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری
کے۔ تیسرا عہد صلح کرنا یہودیوں کا قریظہ اور نضیر اور قینقاع
کے جناب پیغمبر صلعم سے باایں شرط کہ طرفین میں کوئی مددگاری

تلک دوسرے کے دشمنوں کی نہ کرے خود جنگ کرنے
کا تو کیا دخل ہے۔ چوتھا مقرر ہونا طریقہ اذان کا واسطے
خبردار کرنے نمازیوں کے نماز اور جماعت سے مطابق خواب
عبداللہ بن زید انصاری یا عمر فاروقؓ کے۔ بروائت
جبرئیل علیہ السلام نے بھی آکر طریقہ خاص اذان کا
تلقین فرمایا۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

رسالہ کسب النبی کو مصنف نے مسلمانوں کو صنعت و حرفت
کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لکھا تھا۔ مسلمانوں کی بھلائی، بہبودی اور
خوشحالی حضرت مولانا کے پیش نظر تھی۔ اور ان کا مقصد مسلمانوں کی
آخرت اور دنیا دونوں کو سنوارنا تھا اس لئے جہاں انہوں نے فضائل
رمضان اور رسالہ نماز جیسے کتابچے لکھے وہاں مسلمانوں کی دنیاوی زندگی
میں طمانیت اور خوشحالی لانے کے لئے رسالہ کسب النبی بھی انھوں
نے لکھا۔ اس رسالہ کی تصنیف کے سلسلے میں حضرت مولانا نے
رسالہ کے شروع میں خود ہی وضاحت فرمادی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"امابعد عاصی ظہور الحق عظیم آبادی عفی اللہ عنہ
جو حرفت کے مسئلوں کو اپنے والد ماجد اور اکثر علمائے
سفر دیدہ اور عجم گردیدہ اور مکی و مدنی علمائے کبار کے صحبت دیدہ
سے تحقیق کیا اور اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد ہوا عوام
و خواص کے نفع کے لئے بجنسہ اس تقریر کو ہندی میں

لکھ دیا۔ الٰہی قبول کر۔ آمین ثم آمین۔

اس کتابچہ کی کتابت سنہ ۱۲۶۱ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے کاتب تیغ علی ہیں جو غالباً حضرت مولانا کے مرید ہوں گے اس کتابچہ کے آخر میں سنہ کتابت اور مصنف کا نام اس طرح درج ہے:۔

"تمام شد بہ تاریخ یازدہم شہر ذیقعدہ روز چہار شنبہ سنہ ۱۲۶۱ھ مطابق سنہ ۱۲۵۳ فصلی از خط بندہ تیغ علی بمقام بریول (در بھنگہ۔ بہار) تحریر یافت۔"

اس رسالہ کا نمونۂ تحریر درج ذیل ہے:۔

"بات یہ ہے کہ لوگ ناواقف کاری کے سبب اکثر کسب و حرفت کو کہ جس کو نبیوں نے کیا ہے ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ اس کا حال مختصر سا یہاں پر بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ واقف ہو جائیں اور عیب نہ کریں اور سب کوئی حرفت کر کے دکھلا دیں اور خوب سیکھیں اور سکھلا دیں۔"

سوال

"عوام لوگ جو کھیتی کرنے والے اور کپڑے سینے والے اور بننے والے اور حرفت کرنے والے پر طعن کرتے ہیں کچھ قرآن و حدیث اصول و فقہ سے بھی اس

کی برائی ثابت ہے یا نہیں۔ یعنی صاف کہدو اور اجر خدا سے لو۔

جواب

"قرآن و حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان حرفتوں کو نبیوں نے کیا ہے۔ اس کو یا اس کے کرنے والے کو جو برا سمجھتا ہے۔ وہ مردود ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جو لوگ اہل سنت و الجماعت ہیں کبھی اس کو برا نہ سمجھیں گے۔"

---

(۱۷) حضرت شاہ ابوالحسن فردؒ

حضرت شاہ ابوالحسن فردؒ حضرت شاہ محمد نعمت اللہؒ کے خلف الرشید اور جانشین تھے۔ آپ بڑے صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبان میں قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ آپ اپنا کلام اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ نورالحق تپاںؒ کو بغرض اصلاح ابتدا میں دکھلاتے رہے تھے۔ فارسی میں آپ کے دو دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ لیکن اردو کلام آپ کا بہت کم دستیاب ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے ان کے دو اشعار اپنی تصنیف میں نقل کئے ہیں

وہ یہ ہیں :ـــ

نگاہِ مست تیری کس قدر خوں ریز عالم ہے عبث آنکھوں کو تیری نرگس بیمار کہتے ہیں

عشق نے رسوا کیا یاں تک مجھے نام سے میرے حیا کو ننگ ہے

لیکن حضرت فَرد کے اردو مراثی ملتے ہیں۔ قرینہ اغلب ہے کہ آپ اردو میں زیادہ تر مراثی کی طرف متوجہ تھے ۔ آپ کے پینتیس[۳۵] اُردو مراثی پھلواری شریف بڑی خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان مراثی میں کچھ تو مسدس کی شکل میں ہیں لیکن زیادہ تر چوپائی کی شکل میں ہیں ۔ ایک مرثیہ سے جو مسدس کی شکل میں ہے پانچ بند بلا ترتیب درج ذیل ہیں :ـــ

(۱)

اس طرح قافلے پھرتے ہوئے گم جاتے ہیں
جس طرح آج کے دن اہلِ حرم جاتے ہیں
کفِ افسوس سبھی ملتے بہم جاتے ہیں
تربہ تر اشک سے سرتابہ قدم جاتے ہیں
کار دالندہ ندارند دراو دجرسے
نہ رفیقے نہ انیسے نہ کسے ہم سفرے

(۳)

راحت عیش تھا بے قدر برابر با خاک
گرد کیں سے تھا دل سینۂ بے کینہ پاک
آستیں اشک سے ترجیب و گریباں سب چاک
منہ پہ تھا گرد الم آنکھیں تھیں خوں سے نمناک

بہ زمینیکہ فتادے کف پائے ایشاں
لالہ می رست زخوں نابہ چشم ایشاں

(۲۰)

سازو سامان سفر بے سرو سامانی تھی
دست تقدیر میں سونپے ہوئے تھے کام سبھی
سب کی آنکھوں سے تھا خوناب کا دریا جاری
تھی اٹھی سب کے دل و جاں سے تمنائے خوشی

رہرو انند شکستہ دل وخستہ جگرے
جز غم و درد ندارند انیسے دگرے

(۲۱)

ضبط نالہ کریں تو سینہ پھٹا جاتا ہے
نہ کریں گریہ تو دل غم سے جلا جاتا ہے
ناتوانی سے بدن اپنا گرا جاتا ہے
صبر کا تاب و تواں دل سے اٹھا جاتا ہے

رہ دراز است مرا طاقت رفتار نماند

تا بہ عمرم بجز از رنج سروکار نماند

(۲۳)

صبر دل چاہیئے تا ہو رقم درد و الم
آگیا رعشہ و اندیشہ میں اب دست قلم
اب زباں پر ہے ہر اک فرد بشر کے ہر دم
جب مددگار مرے ہیں یہ امام عالم
در کمینم فلک از گشت نہ باشد باکم
کہ فلک را نہ رسد دست بہ سوئے خاکم

آپ کی پیدائش ۱۱۹۱ھ میں ہوئی اور وفات ۱۲۶۵ھ میں

---

(۱۸) حضرت میر محمد باقر حزیں

حضرت میر محمد باقر حزیں رحمۃ اللہ علیہ رہنے والے تو دہلی کے تھے لیکن نادر خاں کے حملہ کے بعد غالباً ۱۱۵۴ھ میں عظیم آباد چلے آئے اور یہیں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہ صاحب علم و فضل اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مرید تھے۔ اپنا کلام بھی ان ہی کو دکھلاتے تھے۔ مولف تذکرہ فتح علی گردیزی نے ان کا سال وفات ۱۱۶۵ھ لکھا ہے۔

شورش عظیم آبادی ان کے مخصوص شاگردوں میں تھے۔ سودا

اور دوسرے معاصرین ان کے علم وفضل اور شاعرانہ کمال کے باعث انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے ؎

یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا تھا یوں کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

ویران ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

جو ہیں آنکھوں کے مخمور اون کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کے جو ہیں نشہ اون کو پیمانے سے کیا نسبت
ہوا ہے تو حریں دیوانہ ان شہری غزالوں کا
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت

---

(۱۹) حضرت شاہ رکن الدین عشقؒ

حضرت شیخ رکن الدین عشقؒ عرف شاہ گھسیٹا کے والد ماجد کا نام شیخ محمد کریم فاروقی تھا۔ آپ حضرت شاہ محمد فرہاد ابو العلائیؒ کے نواسے تھے۔ دہلی کے بہت ہی ذی عزت صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ درانیوں کے حملہ کے بعد دہلی جو طوائف الملوکی کا شکار ہوئی اس سے گھبرا کر انہوں نے ترکِ وطن کیا۔ اور پہلے مرشد آباد پہنچے اور

وہاں بقول مولف "تاریخ شعرائے بہار" نواب میر قاسم علی خاں کے دربار میں ہزار سوار کی افسری کے منصب پر فائز ہوئے۔

مولوی سید حسن رضا صاحب ثاقب عظیم آبادی نے اپنی تصنیف یادگارِ عشق میں حضرت عشق کی عمر ایک سو سال لکھی ہے اور اسی بنا پر سال ولادت سنہ ۱۱۰۳ھ متعین کی ہے۔ کیونکہ آپ کا وصال سنہ ۱۲۰۳ھ میں عظیم آباد میں ہوا۔ ان کے شاگرد رشید اور مرید مرزا محمد علی فدوی نے تاریخ وفات یوں لکھی ہے:ـ

گفت فدوی سال تاریخ وفات   ہادی ماشاہ رکن الدین عشق

۱۲۰۳ھ

کچھ عرصہ فوجی ملازمت میں رہنے کے بعد دنیا سے طبیعت پھر گئی اور ترک ملازمت کرکے عظیم آباد میں گوشہ گیر ہو گئے۔ اور اپنی بقیہ ساری زندگی عبادت و ریاضت اور خدمت خلق میں گزار دی۔ حضرت مخدوم منعم پاک قدس اللہ سرہ العزیز کی خاص توجہ اور نظر عنایت نے ان کی روحانیت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ ڈھاکہ۔ مرشد آباد اور عظیم آباد میں آپ کے بیشمار مریدان آپ کی عقیدت اور محبت میں سرشار تھے۔ نواب علی ابراہیم خلیل نے اپنے تذکرہ میں حضرت عشق کا ذکر بڑے ادب اور احترام سے کیا ہے۔ لیکن سنہ وفات انہوں نے سنہ ۱۱۹۵ھ لکھی ہے۔ اور یہ عجیب ہے کیونکہ سوائے ان کے اور کسی نے ایسا نہیں لکھا۔ حضرت عشق کے مرید اور شاگرد رشید مرزا محمد علی فدوی

نے جو سنہ وفات لکھا ہے وہ اوپر گذر چکا۔ محمد یحیٰی صاحب مرحوم نے بھی آفتاب طریقت سے جو سنہ وفات نکالا وہ بھی سنہ ۱۲۰۳ھ ہی ہوتا ہے۔

نواب مصطفےٰ علی خاں شیفتہ نے بھی اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں حضرت عشق کا ذکر "از سخن پروران معروف عظیم آباد" کی حیثیت سے کیا ہے۔

حضرت عشق اردو اور فارسی دونوں زبان کے قادر الکلام شاعر تھے اور اپنے معاصرین شعرا میں اپنے علم و فضل اور کمال شاعری کی بنا پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے اردو دیوان کا قلمی نسخہ تکیہ حضرت عشق پٹنہ سیٹی میں محفوظ ہے اور اس کا دوسرا قلمی نسخہ خانقاہ پھلواری شریف کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ مولوی کریم الدین صاحب مرحوم نے تذکرہ طبقات الشعراء میں ایک تیسرے قلمی نسخہ کی بھی نشان دہی کی ہے جو پیرس میں گارساں دتاسی کے پاس تھا۔ خانقاہ پھلواری شریف والے قلمی نسخہ میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں اور مثنویاں بھی ہیں۔

حضرت عشق کے تفصیلی حالات اور شاعری سے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لئے ثاقب عظیم آبادی کی تصنیف "یادگارِ عشق" کا مطالعہ مناسب ہوگا۔

اس میں علامہ سید سلیمان ندوی کا مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل کتابچہ اسلامی پریس صدر گلی پٹنہ سیٹی

سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے باب میں حضرت عشق کے حالات زندگی ہیں۔ دوسرے میں ان کی خصوصیات شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اور تیسرے میں انتخاب کلام پیش کیا گیا ہے۔

حضرت عشق کی شاعری میں صوفیانہ اور عارفانہ رنگ بہت نمایاں ہے اور عشق میں سرشاری اور مستی نے ان کے کلام میں عجیب کیف و سرور پیدا کر دیا ہے۔ زبان کی سلاست اور روانی اور شیرینی کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں سوز گداز کی بھی فراوانی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کو پڑھ کر میر تقی میر اور درد دونوں کا لطف آتا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

آہ جاں سوز کو سر دفتر دیوان کیا — عشق نے دیکھتے ہو پہلے ہی طوفان کیا

عرش تا فرش سیر کر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

آگے میاں نصیب ہے سرسبز ہو نہ ہو — دل کی زمیں میں تخم محبت تو بو دیا

چین ہی اس دل بیتاب کا منظور نہ تھا — ورنہ آنا ترا مجھ پاس تو کچھ دور نہ تھا

داغ دل کا تو کبھی ہم سے مٹایا نہ گیا — یہ دیا وہ ہے جو دن کو بھی بجھایا نہ گیا

نہ بتخانہ کو جاتے ہیں نہ کعبہ میں بھٹکتے ہیں
جہاں تم پانوں رکھتے ہو وہاں ہم سر پٹکتے ہیں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ کیوں تو نے رو دیا
دل نے کیا تھا جمع سو آنکھوں نے کھو دیا

عشق یا دش بخیر اے یارو
آگے آتا تھا اب نہیں آتا

محنت دل سوئے دیدہ آتا ہے
ٹوکو مت یا نور دیدہ آتا ہے

دل دھڑکتا ہے آج کچھ بے طور
کوئی خنجر کشیدہ آتا ہے

تیر کے نام پر تڑپتا ہے
اس طرح کا کہیں جگر دیکھا

ڈر سے اس کے زباں پہ حرف نہیں
تس پہ ہے بدگمان کیا کیجئے

اس کے دامن تلک نہ پہونچے ہم
خاک میں آپ کو ملا دیکھا

میری آنکھوں سے وہ جدا ابھی نہیں
گو وہ مجھ پر نظر نہیں رکھتا

بسا ہے دل میں آہ خانہ ویراں خداوندا اسے آباد رکھنا

اپنی آنکھوں سے پوچھ اے خوش چشم مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا

ممکن نہیں جی بچے سحر تک باقی ہے ابھی دو پہر رات

جان کو بے قرار پاتے ہیں دل کو بے اختیار پاتے ہیں

یہ حسن یہ ادا یہ نگاہیں یہ گرمیاں نام خدا کہاں ہیں کسی طرحدار میں

نذر کو کچھ نہ تھا مجھ پاس دل بے اختیار لایا ہوں

ایک دن بھی خیالِ دلداری نہ کیا آہ تو نے پر نہ کیا
کون سی رات خونِ دل سے عشق دامن و آستیں کو تر نہ کیا

جاتا ہے فلک کے پار نالہ یہ تیر بھی کارگر نہ ہوگا

دل کے ہاتھوں خراب پھرتا ہوں اس میں کچھ اختیار ہے میرا

بولئے تو زبان جل جائے   چپکے رہئے تو جان جل جائے

کس کی بستی ہے کون بستا ہے   کربلا جس کے گھر کا رستا ہے

تم عبث اب ڈھونڈتے ہو آشیاں عندلیب
مشت پر گلشن میں باقی ہے نشانِ عندلیب

---

(۲۰) حضرت مرزا محمد علی فدوی رح

حضرت مرزا محمد علی فدوی عرف مرزا بھجو کا مولد دہلی ہے لیکن مسکن اور مدفن ہونے کا فخر عظیم آباد کو حاصل ہے۔ اپنے استاد اور حضرت عشق کی طرح یہ بھی دہلی کی طوائف الملوکی سے متاثر ہو کر مرشد آباد چلے گئے تھے اور پھر وہاں سے ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد تشریف لے آئے اور مستقل سکونت پذیر[۱] ہو گئے۔

علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم حضرت عشق سے حاصل کی اور ان سے حد درجہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ ۱۲۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کو فن موسیقی پر بھی دستگاہ تھی۔ اردو کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے اردو دیوان کا قلمی نسخہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں موجود ہے۔ دوسرا قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک

---

[۱] ملاحظہ ہو تذکرہ گلزار ابراہیم و تذکرہ گلشن بنجار صفحہ ۱۴۷ و تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۱۳۲

سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں بھی ہے۔

حضرت فدویؔ کا کلام سوز و گداز کا مرقع ہے۔ زبان کی شیرینی صفائی اور سادگی انہوں نے اپنے استاد سے لی ہے۔

حضرت فدویؔ پر ڈاکٹر حسنین عظیم آبادی نے بہت محنت سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی ملی ہے۔ اپنے اس ضخیم تحقیقی مقالے میں انہوں نے تفصیلی حالات زندگی کے ساتھ ان کا دیوان بھی شامل کر دیا ہے۔ اس کتاب سے چند اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں :-

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بن ملے تو یہ حال ہے فدویؔ
وہ ملے گا تو کیا غضب ہوگا

کیوں کی ادھر نگاہ جو وہ مجھ کو پا گیا
دل پر ہوئی جو ہونی تھی آنکھوں کا کیا گیا

بیخودی اور شرم سے باتوں کا کس میں ہوش تھا
وہ ادھر خاموش تھا کل میں ادھر خاموش تھا

وہ ہم پہ مہرباں کبھی ہے کبھی نہیں
جینے کا اب گمان کبھی ہے کبھی نہیں

پھرتے تھے تم تو آنکھ بچائے چھپے چھپے ‫ ‫ نکلا کدھر ہے چاند جو آئے چھپے چھپے

تری ہم نے تاثیر بس آہ دیکھی ‫ ‫ نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

گالیاں کیونکر نہ دیوے تو نے فدوی چھیڑ چھیڑ
ایک تو وہ تھا ہی اس کو اور بھی بدخو کیا

گر خاک یہ میری کبھی اے یار گذرنا ‫ ‫ مت بھول کے ہرگز معہ اغیار گذرنا
ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر ‫ ‫ مرجائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا
ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا ‫ ‫ پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا
گر تجھ کو ان ہی آنکھوں کی قسم تیر نگہ ہے ‫ ‫ ٹک دل کو بچا سینہ کے تو یار گذرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا ‫ ‫ اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا

کل یار کے کوچہ کی طرف گزرے گا فدوی
مت آج سے اس طرف کو اغیار گزرنا

---

(۲۱) حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامیؒ

حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامیؒ المتخلص فخریؔ حضرت مخدوم فرید طویلہ بخش کے جانشین اور اولاد میں سے تھے۔ آپ بہار شریف محلہ چاند پور میں رہتے تھے۔ علوم ظاہر

باطنی کے لحاظ سے آپ اپنے معاصرین میں بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ کے علم وفضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے عوام میں بہت محبت اور عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت شاہ علیم الدین فردوسیؒ سجادہ نشیں خانقاہ معظم بہار شریف سے آپ کے بڑے گہرے اور مخلصانہ روابط تھے۔

حضرت فخریؔ فارسی اور اردو دونوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن فارسی کے تو کچھ کلام مل بھی جاتے ہیں۔ اردو کلام ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کے خاندانی بیاض سے آپ کی ایک اردو نظم اپنی تصنیف "بہار اور اردو شاعری" کی تصنیف کے دوران مجھ کو ملی تھی۔ اس کتاب کے حوالہ سے اس جگہ درج ذیل ہے۔ اس نظم کی وجہ تنظیم اس خاندانی بیاض میں اس طرح لکھی ہوئی ہے:۔

"می آرند کہ حضرت شاہ علیم الدین فردوسیؒ را کسے از اولاد ذکور نہ بود۔ عمرش کثیر چوں فلک پیر و موئش سفید مثال خورشید می دمید۔ روزے داغ نہانی و غم پنہانی فرزند بقائے نام و نشانی بر شاہ احسان اللہ چشتیؒ آشکارا کرد۔ ازاں کہ میاں ایں دو بزرگوار مودت و محبت بے نہایت بود۔ وے حضرت بمسند سجادگی صاحب الولایت از خلف رشید و اولاد

---

[1] حیات ثبات قلمی صفحہ ۳۸ بہ حوالہ خاندانی بیاض خانقاہ معظم۔

سعید خالی دیدن نمی توانست حسرتہا خورد ولیس مشورہ
قائم کرد۔ وہم چناں ساز کردند تا روزے حضرت شاہ علیم الدین
را با خواں چادر و شیرینی و گلہا بخورہا از خانقاہ حضرت
مخدوم جہاں ہمراہ گرفتہ است و خراماں و اشک ریزاں
و ایں منقبت در حال خواناں تا بارگاہ مخدوم جہاں
رسیدہ اند و ما و جب گردانیدہ خود بہ مواجہ مزار شریف
مراقب شدہ است و شب درآں جا گزرانیدہ آخر بشارت
یافتہ است برائے پسر ذی جاہ وہم چناں بہ وقوع آمدہ
کہ حضرت شاہ ولی اللہ محبوب ترین فرزنداں مخدوم جہاں
پناہ چون ماہ نیمہ ماہ ظاہر شد الحمد للہ علی ذالک"

"نظم در منقبت حضرت مخدوم جہاں از حضرت شاہ احسان اللہ چشتی
نظامی فخری"

یا شرف دیں تجھ شرف سے جملہ عالم پر شرف
جملہ عالم پر شرف ہے تجھ شرف سے ہر طرف
ظلم کرنا چاہتا ہے حاسد ناداں حرف
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

ایک تو میں ہوں اکیلا دوسرے سنسان ہے
تس اوپران حاسدوں کے راہ کا گھمسان ہے

تم کرو آباد اس جنگل کو جو ویران ہے
مشکلیں آسان کرو میری پئے شاہ نجف

سگ ہوں میں در کا تمہارے اپنا جھوٹا دو مدام
مت کھلاؤ تم کبھی ناپاک کے گھر کا طعام
گرچہ سختی ہو مجھے پر دور رکھو از حرام
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

جو مرادیں تھیں مری سب تم نے بر لایا شتاب
شاد ہیں سب دوست میرے اور ہیں دشمن کباب
آرزو اک اور میں رکھتا ہوں اے عالی جناب
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

وہ مراد اب دل کی میری زود تم حاصل کرو
حاسد بدخواہ کی باتوں کے تئیں باطل کرو
دین اور دنیا میں تم مجھ پر نظر کامل کرو
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

یا شرف دیں تجھ ستی رکھتا ہوں میں یہ التجا
شاہ علیم الدین دے تو اک پسر بہر خدا
ورنہ چنگل میرا اور دامن ترا روز جزا
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

سال ہجری گیارہ سو اسی اور اس پر پانچ ہے ۱۱۸۵

یہ حکایت بولتا ہوں تم سنو سب سانچ ہے
لگ رہی اب دل میں میرے عشق کی سو آنچ ہے
مشکلیں آسان کرو میری پئے شاہ نجف

رات دن ہے درد فخری یا مظفر شاہ دیں
یا مظفر شرف دیں حاجت روائے سر زمیں
آرزو کو تم سے پوچھوں دل کو ہے میرے یقیں
مشکلیں آساں کرو میری پئے شاہ نجف

اس نظم کا سنہ تصنیف جیسا کہ حضرت فخری نے خود لکھ دیا ہے۔ ۱۱۸۵ء ہے۔

---

(۲۲) حضرت مخدوم شاہ امیر الدین فردوسی قدس اللہ سرہٗ

حضرت مخدوم شاہ امیر الدین فردوسیؒ حضرت مخدوم شاہ ولی اللہ فردوسیؒ کے فرزند تھے۔ آپ کی پیدائش ۹ محرم ۱۲۱۷ھ کو ہوئی تھی۔ آپ کی تصانیف میں ایک جگہ ایک قطعہ آپ ہی کا لکھا ہوا ملا ہے۔ جس سے تاریخ ولادت کی تصدیق ہو جاتی ہے:۔

زروے سال ہجری وقت پیدائش سے اس دم تک
کہوں کیا کہ: سے جائے استقامت یہ خرابہ ہے
سنا ہے یوں کہ فکر: الہ غفران پناہی ہے

دعائیہ سنہ تاریخ برخوردار آیا ہے

۱۲۱۷ھ

آپ کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی مسلمہ بھی بڑی پاکباز اور خدا ترس خاتون تھیں۔ یہ حضرت سید شاہ فیاض رحؒ کی صاحبزادی تھیں۔

آپ نے علوم متعارفہ کی تعلیم مولانا سید عزیز الدین شاہ قطب الدین عرف شاہ لبا دن کرجوی خلیفہ حضرت مخدوم شاہ منعم پاک قدس اللہ سرہٗ سے فرمائی اور ان ہی کے دست حق پرست پر آپ نے سلسلۂ فردوسیہ میں بیعت طریقت بھی حاصل کی تھی۔ اپنے والد ماجد کے علاوہ کچھ فیض باطن آپ نے حضرت شاہ ابوالحسن بن شاہ ابوالبرکات ابوالعلائی قدس اللہ سرہٗ سے بھی حاصل فرمایا تھا۔

اپنے والد ماجد کے وصال کے بعد ماہ رجب سنہ ۱۲۳۴ھ میں سجادہ نشین خانقاہ معظم مخدوم الملک ہوئے اس وقت آپ کا سن سترہ برس تھا۔ آپ مرض بواسیر کے دائمی مریض تھے اور اس سے بڑی تکلیف رہتی تھی لیکن آپ ان تکالیف کی وجہ سے اپنے معمولات میں کبھی فرق نہ آنے دیتے تھے۔ وہی تہجد اور شب بیداری تلاوت کلام پاک اور ورود وظائف۔ غذا آپ کی بہت مختصر تھی اور دن رات میں صرف ایک بار۔ مولف حیات ثبات نے لکھا ہے کہ جسم کی لاغری اور ضعف کی وجہ سے چہرے پر زیادہ وجاہت نہ تھی۔ لیکن ہمہ دم چہرے سے نور اور جلال ہویدا تھا۔ لوگ اُن کے سامنے بہت ادب سے بیٹھتے تھے۔ ہم عصر

مشائخ ان کے علم وفضل اور زہد واتقا کے باعث ان کی تعظیم اور توقیر کرتے تھے۔

آپ کو ورد وظائف سے جب فراغت ملتی تو فکر سخن میں مشغول ہوجاتے اور اس کے ذریعہ اخلاق وتصوف کی باتیں عوام تک پہنچاتے۔ شعر وشاعری میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ فارسی میں ظلوم اور اردو میں وجد تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں آپ کو قدرت تامہ حاصل تھی۔ فارسی میں آپ علی حزیں کا تتبع کرتے تھے اور اردو میں راسخ کی روش کے دلدادہ تھے۔ آپ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں جملہ اصناف شاعری پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ آپ کا اردو کلام غیر مطبوعہ خانقاہ معظم بہار شریف میں محفوظ ہے۔

آپ نے ایک جگہ ساقی نامہ میں اپنے مرشدوں کا ذکر کیا ہے۔ اسے پیش کرکے کچھ اشعار بطور نمونہ اپنی تصنیف تاریخ سلسلۂ فردوسیہ کے حوالے سے درج ذیل ہیں :-

ساقی نامہ

یارب دے ز راہِ مہربانی — پس خوردہ آں حسین ثانی

پھر راہ کرم دو چار چسکی — دے شاہ حمید کے حصص کی

جو ساقی جام اولیں ہے — پیر من بندہ کہیں ہے

وہ شیخ زمان راجگیری — دانندہ طور دستگیری

من بعد ز فضل منعما تو — دے جام ابوالحسن سے ایک چلو
آنکھوں کو مری وہ روشنائی — صاحب نشۂ ابوالعلائی

شرار حسن سے تیرے نہیں کوئی خالی — حرم کا سنگ ہو پتھر ہو یا کلیسا ہو

کرتا ہوں سراپا کو ترے نقش میں دل پہ — تصویر تری زیر بغل جائے تو اچھا
بے یار کے جینے سے تو مرنا ہی بھلا ہے — اب جاں مری تن سے نکل جائے تو اچھا

روح کا آنا تھا قالب میں وہ آنا کیا تھا — جان کو تن سے نکل جانا تھا جانا کیا تھا
لاکھ دل ہوتا تو سر پہ سے تصدق کرتا — ایک اس دل کے لئے تم سے بہانا کیا تھا

جا کے جو لالہ زار میں دیکھا — اس دل داغدار میں دیکھا
دل کا سارا غبار دھو دینا — دیدۂ اشکبار میں دیکھا

نسیم صبح جو لائی ترے بدن کی بو — قبائے غنچۂ گل میں چھپی چمن کی بو

منظور نظر کون ہے اب تم سے زیادہ — رکھے جو عزیز آنکھوں میں مردم سے زیادہ
پوشیدہ نہیں عشق کے دریا کا تلاطم — یہ بحر خطرناک ہے قلزم سے زیادہ
خندۂ بے تبسم ترا قاتل ہے فزوں تر — جی لینے میں پکے ہے تکلم سے زیادہ

توقیر ہر اک چیز کی ہے اپنی جگہ میں مخمل کی کہیں قدر ہے قاقم سے زیادہ

آپ کا وصال ۵ رجمادی الاول ۱۲۸۷ھ جمعہ کی شب کو ہوا
حضرت شاہ محمد یحیٰی ابو العلائی رحؒ نے مادہ تاریخ وصال ع
"شاہ فردوس بہ فردوس رسیدہ"
۱۲۸۷ھ
نظم کیا ہے۔

حضرت شاہ محمد تقی بلخی فردوسی رح حضرت شاہ محمد تقی بلخی فردوسی رح

(۲۳) حضرت محمد تقی بلخی فردوسی

حضرت شاہ محمد ظہور الحق ظہور کے ہمعصر تھے۔ ان کے ایک رسالہ کی نشاندہی ڈاکٹر اختر اورینوی نے کی ہے۔ جو ان کو پروفیسر ذکی الحق سے دیکھنے کو ملا تھا۔ اس رسالہ کے کاتب شیخ خیرات علی ہیں جنہوں نے ۱۲۵۶ھ میں اس کی کتابت کی ہے اور اس وقت حضرت مصنف بھی بقید حیات تھے چونکہ کاتب مصنف کے نام کے ساتھ "مدظلہ" لایا ہے۔ کاتب کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"تمام ہوئی یہ کتاب ترجمہ ہندی تصنیف شاہ محمد تقی بلخی فردوسی مدظلہ، کے خط خام سے عاصی حقیر سراپا تقصیر شیخ خیرات علی ولد شیخ نجیب علی انصاری کی رہنے والے محلہ عالم گنج متعلقہ شہر عظیم آباد حال سکونت

موضع ارندہ ضلع شہرنکور بیچ تاریخ دوازدہم شہر ذیقعد ۱۲۴۸ فصلی"۔

اس رسالہ کی تقطیع ۵" × ۹" ہے۔ ۸۹ اوراق۔ پیلے اردلی کاغذ کے ہیں یہ رسالہ عقائد ایمانیات، شرح اعمال اور تفصیل شریعت کے متعلق ایک عمدہ تصنیف ہے۔

رسالہ احکام کی عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے۔

حمد بیقیاس واسطے خداوند برتر کے کہ اپنے قدرت کاملہ سے دونوں جہاں پیدا کیا تو سب کوئی اس کی یگانگی پر اقرار کریں اور معبود اپنا جانیں اور درود بیحد اوپر افضل انبیاء خاتم پیغمبران محمد رسول اللہ علیہ السلام کے کہ حق نے اون کو سب خلقوں سے برگزیدہ کیا اور واسطے بتانے راہ راست کے بھیجا۔ بعد اوس کے کہتا ہے فقیر حقیر سراپا تقصیر محمد تقی بلخی فردوسی کہ اگرچہ یہ قلیل البضاعت اتنا استعداد نہیں رکھتا تھا لیکن بموجب فرمانے بعضے شخصوں کے کہ اوپر فارسی قدرت نہیں رکھتا تھا مسائلات چند کہ جاننا اوس کا ضروریات دین سے تھا کتابیں معتبر سے چن کر زبان ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ اور خوف درازی کلام سے سند لانا اون کتابوں کا ترک ہوا اور وہ کتابیں یہ ہیں۔ شرح عقائد فارسی تصنیف حضرت

ل؎ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ۳۵۹-۳۵۸

مولانا مظفر شمس بلخی کے ۔ رسالہ شرح عقائد تصنیف
صاحب انیس الواعظین کے شرح اوراد مفتاح الصلوٰۃ
الطبعی مالابدمنہ فی الاسلام او ام تصنیف فاضل کامل
علامہ عصر مولوی ظہور الحق دام برکاتہٗ کے کہ فی الحقیقت
ایجاز کے ایجاز ہے ۔ اوراد دہ فضل تصنیف جدنا
حضرت مخدوم حسین العز اشمشی بلخی کے دعائیں اور وردیں
اس کے احادیث صحیحہ سے سند ہے اور مقصود القاصدین
پس اگر کسی کو بیچ اس ترجمہ کے کسی مقام میں شک
واقعہ ہو تو طرف ان کتابوں کے دیکھے اور رفع شک
اپنے کا کرے اور نام اس کتاب کا احکام رکھا گیا۔"
ایک دوسری جگہ سے اقتباس ملاحظہ ہو :۔

ہر عاقل اور بالغ یعنی عورت اور مرد سے جو کہ
جوان ہو پہلے اوس پر فرض ہے کہ ساتھ خدا کے ایمان
لاوے ۔ اور ایمان سچ جاننا بیچ دل کے ہے کہ
یعنی مان لیناں اوس چیز کا کہ خدا کنے سے آئی ہے
اور اقرار زبان کا بھی شرط ہے ۔ واسطے اس کے ساتھ
بیزاری کے ہر دین سے سوائے دین اسلام کے ۔ پس
اگر کوئی کام ایسا کرے یا کوئی بات ایسی بولے کہ جس سے انکار
یا شرک پایا جائے ایمان اوس کا درست نہیں ہے ۔ اگرچہ

نماز پڑھے یا روزہ رکھے۔ نزدیک خدا کے وہ کافر ہے
اور حکم کفر پر اس کے کیا جائے گا۔"

رسالہ کا آخری حصہ ایک دعا کی فضیلت سے متعلق ہے۔ عبارت اس طرح ہے:

"روایت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے
کہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ دو سو برس کی نماز
کو اوس کے کفارہ ہے۔ اور عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ
ہم نے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ چار سو برس
کی نماز گذشتہ اس کے کفارہ ہو۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ
عنہ نے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ سات سو برس
کی نماز گذشتہ اوس کے کفارہ ہو۔ یاروں نے
پوچھا یا رسول اللہ عمر ہم سبھوں کی ستر یا اسی یا سو
ہے۔ اتنا صفت کیونکر ہے، فرمایا کہ نماز مائی اور باپ
اور اقربا بیٹا بیٹی کے اوس کے کفارہ ہو۔ تمام شد

---

(۲۴) حضرت سید شاہ عطا حسین منعمی گیاویؒ

حضرت سید شاہ عطا حسین منعمیؒ حضرت منعم پاک کے سلسلے کے ایک روشن ضمیر بزرگ گذرے ہیں۔ آپ اپنے علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے اپنے ہمعصر صوفیوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کی پیدائش سنہ ۱۲۳۱ھ اور وفات سنہ ۱۳۱۱ھ

میں ہوئی۔ آپ کی خانقاہ محلہ رام ساگر گیا میں ہے۔ آپ کی ایک تصنیف "دید مغرب معروف بہ ہدایت المسافرین" کی نشان دہی سب سے پہلے جناب رخشاں ابدالی صاحب نے کی تھی لکھتے ہیں:-

اس[1] کے مصنف حضرت سید عطا حسین منعمی قدس سرہٗ گیاوی مصنف کیفیت العارفین و کنز الانساب (فارسی) ہیں۔ ہدایت المسافرین حضرت کا مفصل سفرنامہ حج ہے۔ اس کی تین ضخیم جلدیں تھیں (۱) سیر الہند ہندوستان کے مشہور شہروں کے حالات پر مشتمل (۲) زائر عرب (۳) کیفیت مراجعت کتاب کی تالیف سنہ ۱۲۶ھ سے شروع ہو کر سنہ ۱۲۶۴ھ میں اختتام کو پہنچی۔ اس کی پہلی جلد سیر الہند کا کچھ حصہ خانقاہ منعمیہ رام ساگر گیا میں محفوظ ہے۔ جو ۳۵۰ صفحات کو محیط ہے۔"

سیر الہند کی زبان مقفیٰ و مسجع اور پُر تصنع ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب سے اس کی زبان بہت ملتی جلتی ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

"الحاصل[2] بادشاہ بہادر شاہ (ظفر) نے چادر اپنے ہاتھوں سے مزار شریف پر چڑھائی اور پھول کی چادر بھی اس پر رکھی، ازاں بعد تقسیم ہوئی مٹھائی وہاں

---

[1] ندیم بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء ص ۶۶ [2] رسالہ ندیم بہار نمبر سنہ ۱۹۳۵ء ص ۶۶

سے حاضری مجلس خانہ کی نوبت آئی جس وقت مجلس میں شاہ
کالے صاحب لائے تشریف اور اٹھ گئے ان کی تعظیم
کو جوان و ضعیف۔ اس وقت خواجہ اکبر علی صاحب نقیب
الاولیا مجھے لاکے شاہ کالے صاحب سے ملائے مختصرسا
میرا کچھ حال سنائیے کہ یہ بزرگ ہیں۔ پورب کے
رہنے والے مشائخ زادہ۔ باوجود ثروت بہ کمال عقیدت
زیارت کو آئے ہیں پاپیادہ۔ شاہ صاحب مصافحہ کرکے
معانقہ کئے مجھ سے باپاک فقیر بھی ملا بہر تعظیم۔ چوما ان کا
دست پاک کرکے مسکین کا اعزاز و توقیر اپنے پہلو میں بٹھلائے۔"
"جب مشائخ ہوئے مجتمع، قوال اپنا اپنا ساز ملائے
غزلیں طرح کی گائے۔ صوفیائے عظام وجد و شورش میں
آئے۔ ان چشتیوں کے وجد و شورش کا ابو العلائیوں
سے نیا دیکھا انداز۔ پیروں کی توصیف کی غزلوں میں کوئی
جھومتے تھے کوئی روتے تھے بہ خشوع و نیاز۔
"القصہ فقیر بحالت وجد نعرہ کرتا ہوا پہنچا۔ بادشاہ
کے پاس مصافحہ کر ان سے کہا۔ اے بادشاہ دین پناہ
اگر اس غزل کے اشعار و مضمون آپ کے ہیں مقال۔
اگر غور فرمائیے حقیقت میں تو یہ اشعار فقیر مسکیں کے
ہیں حسب حال۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہر و باطن بنایا ہے شاہ۔

اور اس مسکین کی شاہی تو ہے فی سبیل اللہ۔ بہادر شاہ
سن کے عاجز مسکین کی تقریر اور معائنہ کر حالت کیفیت
فقیر حقیر اس مجلس میں فقیر کے ہوئے معانقہ پذیر۔"

(۲۵) حضرت سید محمد اسحٰق عرف پیر دمڑیا رح

حضرت سید محمد اسحٰق عرف پیر دمڑیا حضرت شاہ مجتبیٰ حسین صاحب محلہ دائرہ بہار شریف کے جد اعلیٰ تھے۔ بہار میں صوفیوں کا یہ خاندان عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے حضرت پیر دمڑیا رح علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے ممتاز تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور تخلص فقیر فرماتے تھے۔ آپ کے لکھے ہوئے مرثیے اور حمد و نعت اور صوفیانہ غزلیں بھی ملتی ہیں لیکن وہ نہیں کے برابر ہیں۔ ممکن ہے بہار کے بعض خانوادوں کے سفینوں کی چھان بین کرنے سے ان کے کچھ اشعار مل جائیں۔ آپ کے دو رسالے حضرت شاہ مجتبیٰ حسن صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں ان میں سے ایک کا نام "اصول احکام شرع" اور دوسرے کا "جذبات معینہ" ہے۔

حضرت محمد اسحٰق عرف پیر دمڑیا فاطمی و المرتضوی النسب تھے۔
آپ کا سنہ پیدائش ۱۲۳۲ھ ۱۲۲۴ فصلی ہے۔ جذبات معینہ میں اپنی پیدائش

کے متعلق آپ نے خود تحریر فرمایا ہے کہ :-

"تاریخ چودھویں شہر صفر المظفر روز چہار شنبہ ۱۲۲۴ فصلی یہ کمترین خلائق بندہ نالائق مصنف پیدا ہوا۔ بہ ہزار ناز و نعمت آغوش والدین میں پرورش پا کے سن بلوغ کو پہنچا"

"رسالہ جذبات معینہ میں آپ کے لکھے ہوئے حمدیہ قصیدے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے :-

کس مونہہ سے حمد خالق اکبر بیاں کروں
اور کس زباں سے منت داور بیاں کروں

پھر رسالہ جذبات معینہ کی ابتدا بھی نظم ہی سے ہوتی۔ یعنی حمد و نعت نظم میں ہیں مثلاً :-

حمد بے حد شکر بے حد ذات رب العالمیں
کس زباں سے ہو ادا جب اس کا پایاں کچھ نہیں

شاہ کا گرچہ پتا تم ڈھونڈتے ہو اے فقیر
چشم دل سے دیکھ لو در سینہ ہائے عارفیں

چاہیے اب وصف شاہ انبیا و مرسلیں
مالک ارض و سما و سالک عرش بریں

وصف جس شہ کا کرے خود خالق کون و مکان
کیا لکھے اوس کو فقیر بے نوا کمترین

رسالہ جذبات معینہ کا قلمی نسخہ ۵" × ۹" کے سائز پر چوبیس[۲۴]
صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر کے صفحات غائب ہیں۔ یہ رسالہ
اجمیر شریف کا سفرنامہ ہے۔ جیسا کہ مصنف نے خود لکھا ہے یہ رسالہ
پہلے فارسی میں لکھا گیا تھا لیکن مریدوں کی درخواست اور اصرار پر
حضرت نے پھر اس کو اردو زبان میں ترجمہ کر دیا۔ اس رسالہ کا سنہ تصنیف
مصنف کی مندرجہ ذیل عبارت کے مطابق "روز دوشنبہ تاریخ ساتویں
صفر سنہ ۱۲۷۱ھ مطابق چوبیسویں کاتک سنہ ۱۲۶۲ فصلی روانہ عظیم آباد ہوئے"
سنہ ۱۲۷۱ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس رسالہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے نثر کے
بیچ بیچ میں اپنے لکھے اشعار کافی قلمبند کر دئے ہیں۔ ان اشعار کو اگر
جمع کر دیا جائے تو حضرت مصنف کی شاعری کے نمونے بھی خاطر خواہ جمع
ہو سکتے ہیں اور ان سے ان کی قادر الکلامی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔
اس رسالہ کی ابتدائی کچھ سطور نثر کے نمونے کے طور پر درج ذیل ہیں:

"اب جاننا چاہیئے کہ وجہ لکھنے اس رسالہ کی یہ ہے
کہ جب اس حقیر بے تدبیر کمترین خلائق بندۂ نالائق خادم
الفقرائے آفاق شجاعت العشق فقیر زادہ حقیر سید
محمد اسحاق المشتاق الی اللہ عرف پیر دمڑیا چشتی
النظامی و الملقب من المرشد معدن الفیض بحر حلقہ
ابو العرفان مقبول حسین ابو الفیاضی الباری النکوی

کو اندوہ دینیہ و جذبات معینہ متمکن حال ہوا اور کاشانہ
دیرانہ سے اپنے طرف دار الخیر حضرات اجمیر نور اللہ ارضہ
کے انتقال کیا۔ ابتدائے روانگی سے پھر آنے تک کچھ
عجیب و غریب سامان بندھا و گوناگوں کرامات و عنایات
و انضال اس حبیب ذوالجلال کا اس کے حال پر
رہا کہ اگر مشروح وار کل کو لکھے تو جلد مطول ہوئے
اور حجم بھر نقل نہووے۔ مگر بعض بعض کرامات عجیب
اور وقوعات غریب کہ ہنگام اوس سفر وسیلۃ الظفر کے
مشاہدہ اور معائنہ کرتا تھا جس مقام پر ٹہرتا تھا لکھنے
سے اوسی احوالات کے کاغذ بھرتا تھا اور ایک جدول
بطور جنتری کے بنا لیا تھا کہ سب حالات اوس میں لکھا
گیا تھا کہ وہ مجموعہ زبان فارسی میں بقید روز و تواریخ
و تعداد و منازل ہوا تھا۔ سب مریدان راسخ الاعتقاد
اور دوستان واثق الاتحاد نے دیکھا اور سن کے بہت
خوش ہو داد دیا اور یہ فرمائش بصد تاکید کیا کہ اگر
اس کا ترجمہ زبان ہندوی ہوتا تو خوب تھا بلکہ ہر دل
میں مرغوب تھا کہ وہ سب سن کے خواہش زیارت کی
دلوں میں ہوتی اور یہ کتاب تخم عقیدت کا مزرعہ دلوں میں
بوتی۔ ہر چند عذر کیا اور کہا کہ زبان ہندی میں مجھ کو دخل

نہیں، ہو تیرے معترض کہیں گے چناں وچنیں تس پر
بھی اول لوگوں نے نہ چھوڑا۔ اس عاجز نے بھی ان
لوگوں کے کہنے سے مونہہ نہ موڑا۔ اس لئے خلاصہ حال سفر
اور کیفیات منازل و شہر کے لکھا۔ چونکہ جانا اس کا
صرف بہ کشش و غلبات بقیہ تھا نام اوسکا جذبات معینہ
رکھا تو جو کوئی پڑھے ساتھ دعائے خیر کے اس فقیر کو
یاد کرے، اب التماس بیچ خدمت اہل قیاس حق شناس
کے یہ ہے کہ اس کے مضامین کو سمجھ لیں اور عبارات
غیر فصیح کو خیال نہ کریں بلکہ اگر کوئی الفاظ بے ضابطہ تحریر
اور غیر محاورہ تقریر کے دیکھیں تو ساتھ اصلاح کے بار احسان
کا مجھ عاجز پر دھریں۔"

حضرت پیر دمڑیا کا دوسرا رسالہ" اصول احکام شرح" ہے۔ اس
کا سائز بھی ۵" × ۹" ہے۔ یہ کرم خوردہ قلمی نسخہ ہلکے زرد رنگ کے کاغذ پر
۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ اس
رسالہ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں جذبات معینہ کی طرح مصنف
نے جا بجا ایسے اشعار نہیں قلمبند کئے ہیں۔ غالباً موضوع کا تقدس اور
مضامین کی سنجیدگی مانع ہوئی۔ اس سلسلہ کی عبارت کا نمونہ درج
ذیل ہے:-

"اب آگے اس کے جاننا چاہیے کہ یہ عجیب زمانہ ہے

کہ جس میں وعظ و نصیحت ایک فسانہ ہے۔ کسی کو توفیق
دینداری اور ایمان شناسی کی نہیں۔ اعمال کچھ ہے اور
نیت کہیں اور احکامات شرع کی تلاش کرتے ہیں، آخر
سنی سنائی بات پر چلتے ہیں اور اپنی سمجھ پر مرتے ہیں
اور خوف خدا سے کچھ نہیں ڈرتے ہیں اس جہت سے
ظہور دین مصطفٰے ؐ کے چھوڑ کے راہ ضلالت اور ہلاکت
میں پڑتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی برباد
کرتے ہیں۔ اس واسطے یہ فقیر بے تدبیر کمترین خلائق
بندہ نالائق محمد اسحٰق المعروف پیر دمڑیا چشتی النظامی
...... نسب ہادی الفاطمی والمرتضوی ...... ملت
حنفی مشرب صوفی ...... واسطے عزیزان اور دوستان
کے اکثر کتب ہائے فقہ سے ان اصولوں کو فراہم لا کے
رسالہ مختصر کیا اور نام اوس کا " اصول احکام شرع "
رکھا .... "

" جانو اے مسلمانو کہ ہر کام کے واسطے اصول ہے
کہ بغیر آگاہی اوس کے کرنا فزدل (فضول) ہے پس اسی
طرح سے دس اصول شرع ہیں کہ سب کام اور احکام
مسلمانی کے اوسی کے فرع ہیں۔ فہرست اصولات توحید[1]
ایمان[2]، اسلام[3]، اعتقاد[4]، دین[5]، مذہب[6]، اجتہاد[7]،

ملت، اتفاق، اختلاف، اور شرع کے معنی راہ روشن ہے جو کوئی اس راہ پر چلے گا ضلالت اور ہلاکت میں نہ پڑے گا۔"

رسالہ کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے:۔

اس لئے رسالہ ہندی کیا کہ ہر شخص کی سمجھ میں آجاوے۔ بشکر و احسان خدا کا کہ انجام کو پہنچا۔ اللہ برتر پڑھنے والے کو توفیق دے کہ مصنف کو ساتھ دعائے خیر کے یاد کرے۔"

---

(۲۶) مولوی محمد عالم علیؒ

مولوی محمد عالم صاحب مرحوم تھے تو سررشتہ دار کمشنری اضلاع بھاگل پور لیکن اپنے علم و فضل اور زہد و اتقا کی وجہ سے عوام میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فرائض منصبی سے فراغت کے بعد اپنے وقت کا زیادہ حصہ لکھنے پڑھنے اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ تصوف سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اور اسی لئے عبادت و ریاضت اور عوام میں اخلاق و مذہب کی ترویج پر زیادہ دھیان دیتے تھے۔ آپ کی ایک تصنیف "دہ مجلس" شاہ فخر عالم صاحب سجادہ نشیں خلیفہ باغ بھاول پور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ ہے جو ۱۲۶۵ھ میں مطبع اخوان الصفا کلکتہ میں چھپی تھی اب اس کے نسخے نایاب ہیں۔ یہ چھوٹے سائز کی کتاب

"۵ ½ × ۷ ½ کی تقطیع پر ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

دہ مجلس کی تصنیف مصنف کی ایک تحریر کے مطابق سنہ ۱۲۶۱ھ میں ہوئی تھی۔ مصنف کے سنہ پیدائش اور وفات کا تعین صرف دہ مجلس کے سنہ تصنیف سے کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف لکھتے ہیں:۔

"احباب صادق اور مخلصان واثق کی خدمت میں عالم علی عرض کرتا ہے کہ سنہ ۱۲۶۱ھ میں......... زبان ریختہ اردو میں لکھا ہے۔" پھر فہرست مضامین لکھی ہے۔

لہ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا ص ۳۸۰-۳۸۱

مجلس یازدہم بہ شہادت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام ص۱۲۱ وغیرہ وغیرہ

یہ کتاب بقول مصنف محرم کی مجلسوں میں پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ مجلسیں نثر میں ہیں لیکن اختتام پر خود مصنف کے نظم کئے ہوئے نوحے بھی شامل ہیں۔ ان نوحوں سے مصنف کی شاعرانہ قادر الکلامی اور صلاحیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری میں تخلص عالمؔ ہی استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک نوحہ ملاحظہ ہو:ـ

ابن علی حیدر کرار وا حسین ۔۔۔ سبط نبی احمد مختار وا حسین

زیب کنار فاطمہ زہرا تھی ذات پاک ۔۔۔ دُرج نبی کے تھے دُر شہوار وا حسین

تھے مجمع فضائل و بحر علوم دیں ۔۔۔ علم الیقین کے واقف اسرار وا حسین

توصیف جس کے چہرے کی والشمس ہو سکے ۔۔۔ آغشتہ خاک و خوں ہیں وہ رخسار وا حسین

جس زلف مشکبار کی واللیل ہو صفت ۔۔۔ آلودہ خاک اوس کا ہو ہر تار وا حسین

وہ حلق جو تھا بوسہ گہہ ختم مرسلیں ۔۔۔ چل جاوے اوس پہ خنجر و تلوار وا حسین

عالمؔ کا دل الم سے ہوا بسکہ بے قرار
کہتا ہے رو رو ہر گھڑی صد بار وا حسین

وہ مجلس کے نثر کا نمونہ بھی درج ذیل ہے:ـ

”عقلائے عالم و فضلائے بنی آدم پر واضح اور آشکار ہے کہ آدمیوں کا لباس حیات مستعار ہے اور ان کی عمر کی بنیاد نہایت ناپائدار۔ جس گل نے چمن وجود کے صحرا میں شگفتگی پائی ہے بیشک صرصر فنا سے پژمردہ

ہوا اور جس نے کشور زندگانی میں قدم رکھا اوس نے بالضرور، جان متقاضی اجل کو سونپا۔ چونکہ ایام غم انجام عاشورہ محلِ ماتم دیکا ہے۔ اس واسطے دو کلمہ وفات کے حال میں حضرت سید کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے لکھا جاتا ہے کہ .... ایک دن رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے زانو پر سر مبارک رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور چہرہ نورانی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ فاطمہ زہرا نے کہا وا ابتاہ۔ کچھ جواب نہ دیا۔ پھر کہا باباجان ذرا آنکھ کھولئے اور کچھ مجھ سے بولئے۔ حضرت صلعم نے فاطمہ زہرا کو بیقرار دیکھ کر پاس بلایا اور اپنے سینے سے لگا کر فرمایا خداوندا فاطمہ کو صبر دے۔ اتنے میں حسنین علیہ السلام آئے رخسار سے سینہ مبارک ملتے تھے۔ اور رو رو کر کہتے تھے۔ اے پدر بزرگوار آپ کی مفارقت سے ہمارا کیا حال ہوگا اور تمہارے بعد ہمارے ماں باپ کی غم خواری کون کرے گا۔ ازواج مطہرات اور اصحاب کے رونے سے زمین اور آسمان کانپتا تھا۔ حضرت صلعم نے فرمایا لوگوں صبر کرو۔ اور وہ دن جبریل علیہ السلام عیادت کے واسطے رسول صلعم کے پاس آئے

اور مزاج کا احوال پوچھا۔ فرمایا بہت ناساز ہے۔ تیسرے دن پھر آکر عرض کی یا رسول اللہ حق تعالیٰ نے آج ملک الموت کو حضور میں بھیجا ہے اگر اجازت ہو تو خدمت میں حاضر ہو حکم ہوا آوے۔ جبریلؑ ملول و محزون الوداع الوداع کہتے ہوئے اٹھے اور کہا پھر اتفاق دنیا میں آنے کا نہ ہوگا الغرض ملک الموت نے پکارا کہ اگر اجازت ہو تو گھر میں آؤں اس وقت فاطمہ زہرا حضرت صلعم کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ جواب دیا کہ رسول خدا شدائد مرض میں مبتلا ہیں ملاقات نہ ہوگی پھر اذن طلب کیا۔ وہی جواب پایا۔ تیسری بار ایسی آواز ہیبت سے اجازت چاہی کہ سننے والوں کا بدن ہیبت سے کانپنے لگا۔ حضرت صلعم نے آنکھ کھول کر پوچھا کیا حال ہے؟ فاطمہ زہرا نے عرض کی ایک اعرابی دروازہ پر کھڑا ہوا آنے کی رخصت چاہتا ہے۔ ہر چند عذر کرتی ہوں نہیں مانتا۔ آپ نے فرمایا اے فاطمہ یہ ملک الموت ہے۔ مٹانے والا لذتوں کا، توڑنے والا راحتوں کا، یتیم کرنے والا فرزندوں کا، بیوہ کرنے والا عورتوں کا۔ حضرت فاطمہ زہرا رونے لگیں۔ سید المرسلین صلعم نے فرمایا اے جان پدر

مت رو۔ تیرے رونے سے حاملان عرش روتے ہیں۔"

---

(۲۷) مولانا ولایت علی زبیری صادق پوریؒ

بہار کے اردو نثری ادب میں ہمیں مذہبیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور میرے مفروضہ کے مطابق ایسا ہونا ہی تھا کیونکہ اردو نثر یا نظم کی ترویج اور ترقی میں صوفیائے کرام یا روشن ضمیر علما کا ہاتھ رہا ہے اور ان لوگوں کا ہر کام رضائے الٰہی اور مذہب کی تبلیغ ہی کے لئے ہوتا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا سب مذہب ہی تھا اور یہ مذہب سے ہٹ کر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ ان کی تحریری زبان فارسی تھی لیکن عوام اور ناخواندہ افراد فارسی سے ناواقف تھے اس لئے انہوں نے اردو نظم و نثر کو اپنے خیالات اور تعلیمات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ قدیم بہار کی ادبی روایتیں بھی کچھ ایسی ہی نظر آتی ہیں۔ گوتم بدھ اور ان کے مبلغین نے سارا مذہبی لٹریچر اور اخلاقی ادب اس وقت کی عوامی بولی پالی پراکرت میں پیش کیا تھا۔ بہار کے صوفیا اور علمائے کرام نے بھی یہی روش اختیار کی اور عوام تک پہنچنے کے لئے اردو کو واسطہ بنایا۔

صادق پور، عظیم آباد کا ایک محلہ تھا جسے انگریزوں نے برباد

مخاصمت اور کم ظرفی ۱۸۶۳ء کے بعد کھدوا کر پھینک دیا اور ویران کر دیا۔
لیکن اس کی عظمت اور تقدس کو وہ نہ اس وقت مٹا سکے اور نہ آج
اس میں کمی آئی ہے۔ صادق پور نہ صرف بہار بلکہ سارے برصغیر کی
مذہبی و سیاسی تاریخ میں ایک غیر فانی مقام رکھتا آ رہا ہے۔ یہ ایک
تحریک اور تنظیم کا مرکز تھا جو ہند گیر وسعت اور اہمیت کا حامل تھا۔
اور چونکہ یہ عوامی تحریک تھی اس لئے علمائے صادق پور نے اپنے
پیام کا ذریعہ اردو ہی کو بنایا۔ اور بلاشبہ علمائے صادق پور اور ان
کی تحریک سے اردو زبان و ادب کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔

علمائے صادق پور کی تحریک کا تعلق حضرت سید احمد بریلوی
کی دعوت و تحریک سے تھا۔ حج بیت اللہ سے واپسی میں حضرت سید احمد
بریلویؒ نے صادق پور (پٹنہ) میں قیام کیا اور اس وقت علمائے صادق پور
اور ان کے اہل خاندان سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔
اور پھر آپ نے روانگی کے وقت مولانا ولایت علی، اور مولانا عنایت علی
اور مولوی شاہ محمد حسین کو اپنا خلیفہ متعین فرما کر پنجاب کے مظلوم
مسلمانوں کی امداد کے لئے ہدایت خاص فرمائی۔ علمائے صادق پور
مجاہدین اسلام تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی جہاد فی سبیل اللہ
ہی میں گزار دی۔ مولانا ولائت علی اور عنائت علیؒ نے حضرت سید احمد بریلوی
کے ساتھ پنجاب کے سکھوں سے جہاد کرنے کے سلسلے میں راجستھان،
سندھ، بلوچستان، ایران) اور افغانستان کا سفر بھی فرمایا۔

اور ہر جگہ داد شجاعت دی۔

۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں حضرت سید احمد بریلوی رح کی جنگ بالاکوٹ میں شہادت کے بعد علمائے صادق پور نے اس تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی اور ان کی ثابت قدمی، خلوص اور شجاعت نے بگڑی کو بنا دیا۔ حضرت مولانا ولایت علی رح اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی رح نے نئے سرے سے اس تحریک جہاد کو منظم کر کے کافی طاقتور بنا دیا۔ اور پھر خطۂ پنجاب پر سکھوں کے خلاف چڑھائی کی اور چند سال کے جدال و قتال کے بعد ایک وسیع شمالی مغربی خطۂ ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ سکھوں نے شکست کھا کر انگریزوں کا سہارا پکڑا لہٰذا اب مجاہدین کا ٹکراؤ انگریزی فوج سے بھی ہونے لگا۔ اور اس میں ان لوگوں کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی کو گرفتار کر کے پٹنہ بھیج دیا۔ وہاں سے میعادی مچلکہ پر چھوٹنے کے بعد دونوں بھائی ستھانہ چلے گئے۔ وہیں مولانا ولایت علی نے ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد مولانا عنایت علی رح نے اختیارات سنبھالے اور انگریزوں سے ٹکر لینے کی زور و شور سے تیاری شروع کر دی لیکن ناکام رہے۔

۱۸ / جون ۱۸۵۷ء کو مولوی احمد اللہ صادق پوری اور مولوی شاہ محمد حسین رح صادق پوری ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ کے حکم سے گرفتار کر لئے گئے۔

اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد یہ لوگ چھوڑ دیے گئے۔ کئی برس
بعد ۱۸۶۳ء میں پھر صادق پوری تحریک کے تحت مجاہدین کی ٹکر انگریزوں
سے انبیلہ اور کوہ سیاہ کے میدانوں میں ہوئی۔ علمائے صادق پور پر
جن میں مولوی احمد اللہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی اور مولوی
عبدالرحیم شامل تھے بغاوت کا مقدمہ چلا اور ان لوگوں کو حبس دوام
کی سزا ملی ان کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی اور صادق پور کو
ویران کر دیا گیا۔[1]

یہ تو سرسری جائزہ تھا۔ علمائے صادق پور کی ملک گیر تحریک کا
لیکن اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سے اُردو زبان کو
بے انتہا فائدہ پہنچا۔ علمائے صادق پور کی تحریک جہاد و تبلیغ اسلام نے
جو کہ دراصل حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک کی ایک شاخ تھی۔
ہدایت و تعلیم اور رد مخالفین کے لئے سلیس و عام فہم اردو میں بکثرت رسالے
لکھے اور فارسی سے ترجمے کئے۔ یہ سب مطبوعہ ہیں۔

حضرت مولانا ولایت علی حضرت تاج فقیہ کی نسل سے تھے اور
حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے ہم جد تھے۔ مولانا یحییٰ
کے خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر حضرت سید احمد بریلوی
کی بیعت اور رفاقت نے آپ کو شریعت و سنت کا دیوانہ اور اسلام
کا جانباز مجاہد بنا دیا۔ حضرت مولانا کی متعدد اردو اور فارسی مذہبی

---

[1] یہ تمام واقعات تذکرہ صادقہ میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔

تصنیفات ہیں۔ ان میں سے چند کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) رسالہ دعوت یہ رسالہ اردو زبان میں حضرت مولانا نے لکھا ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ ۱۶ سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کے مضمون کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت سید احمد بریلوی رحؒ کی زندگی کے آخر یا جنگ بالاکوٹ کے فوراً بعد لکھا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم اس کا سنہ تصنیف ۱۸۳۱ء کے لگ بھگ متعین کر سکتے ہیں۔

نمونہ تحریر کے لئے ایک دو جگہ سے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"اے اللہ تجھ کو سب قدرت ہے تو ایسا کرم کر کہ اس رسالہ کو سُن کر ہمارے جتنے بھائی مسلمان ہیں ان کے دل کے شبہے اور وسواس سب جاتے رہیں اور گروہ محمدی میں داخل ہو جاویں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیدھی راہ نجات کی ان کے ہاتھ لگے اور درود ایسے نبی پر اور ان کی آل و اصحاب پر آمین یارب العالمین۔ جو لوگ ہوشیار ہیں وے جو کام کرتے ہیں پہلے اس کے اول و آخر ابتدا و انتہا کو سوچ لیتے ہیں اور ہر جگہ موافقت و مخالفت لڑنے مارنے میں بے تکلف قدم نہیں رکھتے۔ ان کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ بعضے شخصوں کی عادت ہے کہ حضرت

کی بات کو اس کے روبرو قبول نہیں کرتے ان کے
واسطے یہ رسالہ لکھا گیا کہ تنہائی میں اس کو خوب انصاف
اور تامل کی نظر سے دیکھیں اگر کچھ اپنے کام کا پاویں اور
اپنے دین و دنیا کی منفعت سمجھیں تو اس پر چلیں ایسا
نہ کریں کہ مارے خفگی کے پورا نہ دیکھیں کیونکہ عاقلوں
کا قول ہے کہ بات دشمن کی بھی سُن لینی چاہیئے۔ پھر
اگر پسند نہ آوے تو ماننے نہ ماننے کا اختیار اپنے
ہاتھ ہے۔"

"اس رسالے میں تھوڑا سا وہ احوال امام
وقت کا ہے کہ جس کی تحقیق کے واسطے حضرت کے
حضور میں جانا کچھ ضرور نہیں، بلکہ اپنے شہر و دیار میں
جہاں ہووے اس کو تحقیق و تامل کرے۔ یہ باتیں
موجود پاوے گا لیکن انصاف شرط ہے......
حضرت کے پہچاننے کو تھوڑی سی عقل و سیدھی اور
تھوڑی سی واقفیت حدیث سے چاہیئے کہ اکثر
اولیاء اللہ کو پرتو بعضے انبیا کا عنایت ہوتا ہے
ہمارے حضرت کو اللہ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کا پرتو عنایت کیا اور گروہ پر حضرت کے صحابہ
کا پرتو ڈالا۔ کہ لوگوں کے دل میں محبت اتباع سنت

کی اور غیرت ایمان کی حد سے زیادہ ہوئی۔ اللہ کا
دین زیادہ ہونے کے واسطے دل بیقرار ہونے لگا
جب بیقراری حد سے زیادہ بڑھی تو اللہ تعالےٰ
نے ان کے دل میں الہام صادقہ فرمانا شروع کیا۔
اور بشارتیں دیں کہ ہم نے تجھ کو امام صاحب اقبال
اور الوالعزم کیا اور دین کے بنانے میں اور حکمِ
شرعی جاری کرنے میں صاحبِ تاثیر برکت والا بنایا۔
اب تھوڑی سی تیری التفات و توجہ میں لوگوں کو ہم
بڑے بڑے عمدہ مقام پر ولایت کے پہنچا دیں گے۔
اور تھوڑی سی محنت میں ہم تجھ کو سردار بنادیں گے
اور اکثر ملکوں پر فتح دیں گے۔ اور جو کوئی تیرے ہاتھ
پر بیعت کرے گا اس کو آپ میں کفایت کروں گا اور
رستہ دین کا بتاؤں گا اور دنیا سے اس کا دل بیزار
کر دونگا۔"

"پھر جب حق دعوت کا ملک ہندوستان میں ادا
ہو چکا تب بطریق اپنے نبی کے تابعین کے ساتھ ارادہ
ہجرت کا فرمایا۔ پھر جس مقام پر یہ قافلہ متبرکہ وارد ہوتا
تھا، وہاں کے تمام اطراف کے لوگ صورت دیکھنے بے اختیار
ہو کر آتے تھے اور نہایت عقیدت سے بیعت کرتے تھے

باوجودیکہ نہ کبھی کی واقفیت نہ آگاہی بلکہ زبان بھی ان کی نہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح اللہ نے تمام ہند وخراسان کے لوگوں کو مطیع بیعت کر لیا۔ اسی سنت رسول اللہ کے مطابق آج تک کسی کو ہجرت کرتے نہ سُنا تھا سبحان اللہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کا پیرو کامل پیدا کیا۔ بعد اس کے محض اللہ پر توکل کر کے جہاد شروع کیا۔

(۲) رسالہ تیسیر الصلوٰۃ مولانا ولایت علی کا یہ دوسرا رسالہ نماز اور اقسام نماز کے متعلق ہے۔

یہ نو صفحات پر مشتمل ہے۔ نمونہ تحریر درج ذیل ہے۔

"خداوندا آج اس کو امید اپنے اعمالوں کی اور تدبیر کی بالکل جاتی رہی محض بے اختیار ہے تو جیسا چاہے ویسا کرے ہم تجھ کو سپرد کرتے ہیں تو محض اپنے کرم سے اس کو بخش دے۔"

---

(۳) رسالہ شجرہ یا ثمرہ حضرت مولانا ولایت علی کا یہ تیسرا رسالہ طریقہ تصوف سے متعلق ہے

اس میں حضرت مولانا نے تصوف کے متعلق خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے اور بیعت کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

طرز بیان میں خاصا رمز اور کشش ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"ناداںوں کے خیال میں یہ بات جمی ہے کہ
جب تک مرید نہ ہو گے ہمارے گناہوں کی پوچھ ہم
سے ہووے گی۔ بعد اس کے اگلے پچھلے گناہ پیر
بخشوالیں گے اور قیامت میں ان کے جھنڈے
تلے جانے سے کوئی ہمارے گناہ ہم سے نہ پوچھے گا
بلکہ ہمارے پیر سے پوچھیں گے۔ وے جو کچھ جانیں گے
ہم کو اتنا ہی چاہیے کہ پیروں کی جناب میں اپنا
اعتقاد مضبوط رکھیں۔ غرض پیر کو عاقبت کا گدھا
گناہوں کا بوجھ اٹھانے والا ٹھہرایا ہے۔ اس
خیال سے شجرہ کو اپنا ایمان جانتے ہیں اور اس
کی تعظیم حد سے زیادہ کرتے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ کوئی کسی کا عذاب بلکہ کسی کے
سر کا درد بھی اپنے سر میں نہیں لے سکتا۔ کوئی کسی
کے بدلے نہیں پوچھا جاتا۔ ایک دن باپ دادے
پیر استاد سب آنکھیں چرا دیں گے آخر جس کا خون
اسی کی گردن ہو جاوے گی اور ہر مرید کو شجرہ اپنے
پاس رکھنا کچھ ضروری نہیں۔ پیرزادے جو ہر سال
شجرہ پڑھوانے کی تاکید کرتے ہیں ان کی غرض ہر

سال کچھ کھانے کمانے کی ہے ان کا قول مشہور ہے۔
کہ ہرا کھیت مولی کا کہ ایک دفعہ اکھاڑنے سے میدان
ہو جاوے بھلا کھیت ساگ کا جوں جوں کاٹو توں توں
بڑھے۔"

(۴) تبیان الشرک حضرت مولانا ولایت علی نے فارسی زبان میں ایک رسالہ رد شرک لکھا تھا۔
اس کی افادیت کے تحت مولانا نے اسی مضمون کو کچھ اور اضافہ
کے ساتھ پھر اردو میں لکھا کہ عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
اس میں جابجا نثر میں لکھے ہوئے مضمون کو نظم میں بھی قلم بند کرنے
کی کوشش کی گئی ہے۔ طرز تحریر ملاحظہ ہو:۔

"اللہ ہمارا بہت دور ہے شریکوں سے اگرچہ
لوگ اپنی عقل میں آدم مشت خاک کو اس مالک
عرش و افلاک کا شریک جانتے ہیں اور اس
غبار ناپائدار کی تعظیم برابر اس پاک پروردگار
کے کرتے ہیں کہ جس کام میں نبی اور ولی کو دخل
نہیں اور جس کے حکم میں فرشتوں کو دم مارنے
کی طاقت نہیں۔ فعال لما یرید یعنی جس کام کا
ارادہ کرے اس کو کر ہی کے چھوڑے اور کسی کے
روکنے سے نہ رکے:۔"

"بڑے چھوٹے ہیں سارے بے اختیار   جو چاہے کرے میرا پروردگار"

---

(۵) رسالہ بدعت حضرت مولانا ولایت علی نے اس رسالہ میں اشغال مراقبہ خواب رویائے صالحین الہام، وحی اور اقسام الہامات پر کافی خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ دراصل حضرت مولانا نے عوام کو سمجھانے کے لئے لکھا تھا۔ اس رسالہ کے لکھنے کا سبب مولانا نے یہ بتایا ہے:۔

"مولانا اسمٰعیل علیہ الرحمۃ کا رسالہ جس کا نام ایضاح الحق ہے۔ بدعت کے باب میں فارسی زبان میں جو تصنیف فرمایا اس کے سمجھنے کی اکثر لوگوں کو لیاقت نہیں۔ اس سبب اس عاجز سے بدعت کے باب میں آکر پوچھتے ہیں اس واسطے مذہبی زبان میں تھوڑی سی تقریر بدعت کی جو آسان اور سہل اور سوا تقریر مولانا ممدوح کے ہے لکھ دیا کہ ہر کسی کی سمجھ میں آوے اور آیت سے اس کو مدلل کر دیا۔ سیدھی سمجھ والے کو بہت ہے۔"

یہ رسالہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور کلکتہ کے ایک مطبع میں طبع بھی ہو چکا ہے۔ تحریر کا نمونہ درج ذیل ہے۔

"اور متعلق بعثت ——— اور جس کے

بتانے کے واسطے حضرت آئے۔ مثلاً حضرت اس واسطے
مبعوث ہوئے کہ امّت کو منع کریں کہ جس چیز سے
غفلت پیدا ہو اور دنیا میں تنگی ہو وہ نہ کریں۔
چنانچہ مکان، کھانے کپڑے میں حد باندھ دی کہ بہت
اصراف نہ کریں۔ حرام چیزیں نہ کھائیں۔ ریشمی
زرّیں اور کوسم زعفران کا رنگا ہوا کپڑا نہ پہنیں۔
اور امت کو حکم کریں کہ جن باتوں سے خدا کا دھیان
بڑھے اور دنیا کا انتظام درست ہو وہ کریں۔"

حضرت مولانا عنایت علی

(۲۸) حضرت مولانا عنایت علی صادقپوری

صادق پوریؒ مولانا ولایت علیؒ کے منجھلے بھائی اور آپ کے شریک کار
تھے۔ اپنے بھائی کے ساتھ آپ نے بھی حضرت سید احمد بریلویؒ
سے بیعت حاصل کی تھی اور جہاد میں مولانا حضرت سید احمد بریلوی
کے دست راست تھے۔ آپ کی جنگ میں مہارت شجاعت اور دلیری
ضرب المثل تھی اور اپنے ساتھیوں میں خالدِ دوراں کے نام سے
مشہور تھے۔ آپ ایک سپاہی کے ساتھ ایک اچھے سپہ سالار بھی تھے۔
آپ میں فوجی تنظیم کی اللہ نے بہت اچھی صلاحیت بخشی تھی۔
صاحبِ علم و فضل ہوتے ہوئے بھی آپ نے قلم سے زیادہ تلوار

سے کام لیا اور آپ کی زندگی غزوات میں بہت زیادہ گذری. آپ کا صرف ایک رسالہ بت شکن مجموعہ رسائل تسعہ میں ملتا ہے۔ اس کی نشان دہی ڈاکٹر اختر اورینوی نے بھی کی ہے۔ تعزیہ بنا کر غم حسین علیہ السلام منانا آپ نے اس رسالہ میں منع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس طریقے سے امام عالی مقام کا غم منانے سے زیادہ تضحیک کا پہلو نکلتا ہے اور یہ چیز ہندوؤں کے کلچر سے متاثر ہونے کے باعث ہم لوگوں میں پیدا ہو ئی ہے۔

نمونۂ تحریر ملاحظہ ہو:۔

"اسی طرح اب سمجھو وہ جنت جس کی چوڑائی ساتوں آسمان اور زمین کے برابر ہے اور تمام آباد کہیں جنگل اور ویران نہیں ایک بالشت زمین اس کی قیمت میں ساری روئے زمین سے زیادہ ایک ادنیٰ مکان وہاں کا تمام دنیا کے محل سے بہتر یہ نعمتیں اللہ نے امام کو بخشیں۔ بیشک وہ ایسے عیش میں اس وقت ہیں اور ان کا دشمن جو یزید تھا۔ وہ دوزخ میں جلتا ہوگا جس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ چنگاریاں اس کی جیسے اونٹوں کی قطار۔ ساٹھ برس کی راہ سے آدمی کو کھینچتی ہے جیسے

بھو کا اژدہا۔ پھر وہاں کے۔ اونٹوں کے برابر مکھیاں جیسے ہاتھی کھٹمل جیسے گینڈے، جوں جیسے بھینس، یہ سب ہزاروں بدن میں لپٹ رہے ہیں۔ اور سانپ، بچھو۔ بیشمار ایسے زہر دار کہ اگر دنیا میں آکر دم پھونکیں گھانس سارے جہان کی جل جائے اور درخت خشک ہو جائیں۔ وہاں کی بیڑیوں کی زنجیر کی ایک ایک کڑی ستر ستر ہزار گز کی سیخ کا پھل جیسے شیطان کا سر اس کا ایک قطرہ عرق زمین پر نچوڑیں تو تمام زمین کے ڈوم، چمار، خاکروب تک اس کی بو سے تاب نہ لاکر مر جائیں۔ وہ کھانے کو ملے گا اور تانبا پگھلا اور لہو پیپ گرم پانی پینے کو۔"

کتابیات

۱۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ — از مترجمہ سید احتشام حسین — مطبوعہ

۲۔ پنجاب میں اردو — از پروفیسر محمود شیرانی — "

۳۔ دکن میں اردو — از نصیر الدین ہاشمی — "

۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات — از نصیر الدین ہاشمی — "

۵۔ نقوشِ سلیمانی — از علامہ سید سلیمان ندوی — "

۶۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام — از ڈاکٹر عبدالحق — "

۷۔ لنگوئسٹک سروے آف انڈیا — از گریرسن — "

۸۔ ہندوستانی لسانیات — از ڈاکٹر محی الدین زور — "

۹۔ اردو شہ پارے — از " " — "

۱۰۔ اردوئے قدیم — از حکیم شمس اللہ قادری — "

۱۱۔ بہار اور اردو شاعری — از محمد معین الدین دردائی — "

۱۲۔ تحقیقی مقالے — از " — "

۱۳۔ تاریخ سلسلۂ فردوسیہ — از " — "

۱۴۔ لسانی مطالعے — از " — "

۱۵۔ آب حیات	از	علامہ محمد حسین آزاد	مطبوعہ
۱۶۔ گلِ رعنا	از	حکیم عبدالحیٔ	"
۱۷۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو	از	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	"
۱۸۔ جلوۂ خضر	از	صفیر بلگرامی	"
۱۹۔ عرب و ہند کے تعلقات	از	علامہ سید سلیمان ندوی	"
۲۰۔ اردو زبان کا ارتقا	از	ڈاکٹر شوکت سبزواری	"
۲۱۔ تاریخ شعرائے بہار	از	سید عزیزالدین بلخی	"
۲۲۔ کاشف الحقائق	از	نواب امداد امام اثر	"
۲۳۔ کلیات راسخ	از	راسخ عظیم آبادی	"
۲۴۔ راسخ	از	حمیدالدین حمید عظیم آبادی	"
۲۵۔ شعرالہند	از	مولانا عبدالسلام ندوی	"
۲۶۔ گلشن بیخار	از	نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ	"
۲۷۔ تذکرہ نساخ	از	عبدالغفور خاں نساخ	
۲۸۔ تذکرہ گلزار ابراہیم	از	نواب ابراہیم علی خاں خلیل	
۲۹۔ نفحات الانس	از	مولانا عبدالرحمٰن جامی	
۳۰۔ حیات ثبات	از	سید شاہ نجم الدین فردوسیؒ	قلمی
۳۱۔ رسالہ تحقیقات المعانی	از	ملفوظ مولانا امونؒ	قلمی

۳۲۔ راحت القلوب ملفوظات حضرت مخدوم الملک شیخ شرف احمد یحییٰ منیری مرتبہ زین بدر عربی مطبوعہ

۳۳۔ مخ المعانی " " " " مطبوعہ

۳۴۔ خوانِ پُر نعمت (ملفوظات حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ) مرتبہ زین بدر عربی — مطبوعہ

۳۵۔ مونس القلوب ملفوظات — از مخدوم حضرت احمد لنگر دریا — قلمی

۳۶۔ مناقب الاصفیا — از مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ — قلمی

۳۷۔ خزینۃ الاصفیا — از غلام سرور — مطبوعہ

۳۸۔ بزم صوفیا — از صباح الدین عبدالرحمٰن — "

۳۹۔ تاریخ مشائخ چشت — از پروفیسر خلیق احمد نظامی — "

۴۰۔ وسیلۃ الشرف — از سید شاہ فرزند علی صوفی — "

۴۱۔ سیرت الشرف — از جناب ضمیر الدین صاحب — "

۴۲۔ دیوان وجد — از مخدوم سید شاہ امیر الدین فردوسیؒ — قلمی

۴۳۔ تاریخ ہند — از مولانا ذکاء اللہ — مطبوعہ

۴۴۔ تذکرہ علماء ہند — از مولوی رحمان علی صاحب — "

۴۵۔ یادگار عشق — از ثاقب عظیم آبادی — "

۴۶۔ مثنوی ہیر رانجھا — از سید فضل علیؒ — قلمی

۴۷۔ جواہر الاسرار — از قاضی عبدالغفار رغفا — "

۴۸۔ مثنوی گوہر جوہری — از شاہ آیت اللہ جوہری — "

۴۹۔ ندیم گیا۔ بہار نمبر بابت ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۴۱ء

۵۰۔ رسالہ معاصر پٹنہ " ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۶ء

۵۱۔ الامین۔ بہار شریف پوری فائل ۱۹۲۷ء

۵۲۔ ساقی پٹنہ کے خاص نمبر

۵۳۔ صدائے عام پٹنہ کے خاص نمبر

۵۴۔ رسالہ معیار پٹنہ کی فائل

۵۷۔ چھوٹی اور بڑی خانقاہ پھلواری شریف کے کئی قلمی مجموعے اور مخطوطے۔

۵۸۔ حکیم شعیب صاحب مرحوم پھلواروی کے کئی مخطوطات

۵۹۔ خانقاہ منگل تالاب پٹنہ سٹی کی چند قلمی مثنویاں

۶۰۔ خدا بخش خاں کی لائبریری کے قلمی نسخے اور مخطوطات۔

۶۱۔ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات

۶۲۔ شاہ مجتبیٰ حسین صاحب بہار شریف محلہ دائرہ کے ذاتی کتب خانہ کے کئی مخطوطات۔

تمام شد

علم و حکمت کا بہترین سرمایہ

مطبوعات

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

مترجمات پروفیسر عبدالمجید قریشی

عظیم علمائے نفسیات — تصنیف :۔ ایس سٹینز فیلڈ سارجنٹ — ۱۲/۰

چند عظیم علمائے جراثیم — تصنیف :۔ ڈاکٹر پال ڈی کرائف — ۱۰/۰

مقدمہ انسانی (ہیومن ڈسٹنی) تصنیف :۔ لیکامٹ دونوائے — ۸/۰

تصانیف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

حیات حافظ رحمت خاں (طبع ثانی) — ۱۰/۰

لائف آف حافظ رحمت خاں (انگریزی ترجمہ) — ۲۰/-

تعلیمی مسائل پس منظر اور پیش منظر ۸/۰ — علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں — ۱۲/-

تعلیم و تعلم -/۱ — طالب علم کی ڈائری — ۳/-

حاصل مطالعہ -/۸ — غالب نمبر "العلم" — ۱۰/-

راہی و راہ نما -/۶ — چند محسن چند دوست — ۵/-

تالیفات پروفیسر محمد ایوب قادری

خط و خطاطی ۱/۵۰

علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی جلد اوّل و دوم) ۱۶/-

عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ ۱۲/-

تصنیفات سیّدہ انیس فاطمہ بریلوی

یادیں اور خاکے ۳/-

ان کہی کہانیاں ۲/-

تاثرات و مشاہدات ۳/-

پاکستان کا معاشی پس منظر ۳/۵۰

ادب منزل بمنزل ۶/-

تصانیف سیّد مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی

مسلمانان سندھ و کراچی کی تعلیم ۵/-

انگریزوں کی لسانی پالیسی ۸/-

نواب خان بہادر خاں شہید ۴/-

غلام قادر روہیلہ شہید ۲/-

مترجمات اخلاص حسین زبیری ایم اے (مع دیگر حضرات)

اصولِ تدریس ۵/-

اصول و اساس تعلیم ۷/-

ثقافت و انتشار ۶/-

عہد اسلامی میں علمی ترقی ۸/-

ملنے کا پتہ:- سکریٹری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس بی روڈ نزد سرسید گرلز کالج۔ ناظم آباد کراچی